معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۱۵/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

پاکستان میں سالانہ ۲۵۰/روپے   رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ۵۰۰/روپے   رجسٹرڈ ڈاک ۷۰۰/روپے

نوٹ: (ہندوستانی روپے کے حساب سے رقم قبول کی جائے گی۔)

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷ اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ----- Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۸۰   ماہ رجب المرجب ۱۴۲۸ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۰۷ء   عدد ۲

فہرست مضامین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ای میل: email : shibli_academy@rediffmail.com

ویب سائٹ: www.shibliacademy.org

شذرات

فلسطین کے انتخابات میں حماس کو نمایاں کام یابی ملنے کے باوجود یہ شکست خوردہ الفتح سے مل کر حکومت بنانا چاہتی تھی لیکن امریکا اور اسرائیل نے الفتح کو مشترکہ حکومت میں شامل ہونے سے روک دیا، جب حکومت سازی کا وقت ختم ہونے کو آیا تو مجبوراً حماس نے تنہا حکومت بنائی مگر الفتح کے وزرا دفاتر کے سارے اسباب اور سامان لیتے گئے اور اسرائیل، امریکا، برطانیہ اور سارا یورپ حماس کی حکومت کی راہ میں روڑا بن کر کھڑا ہوگیا اور ہر قسم کی مالی و اخلاقی امداد روک دی، تاکہ بھوکے ننگے فلسطینی حماس سے متنفر اور اس کے خلاف بغاوت پر کمربستہ ہوجائیں لیکن جب یہ اقتصادی بائیکاٹ بھی کارگر نہیں ہوا تو دونوں جماعتوں کو باہم لڑا دیا، تاکہ ان کی ساری فوجی قوت ختم ہوجائے اور وہ اسرائیل کی جانب نگاہ اٹھانے کے قابل نہ رہیں اور اسرائیل بے روک ٹوک اپنی من مانی کرتا رہے، سعودی حکمراں شاہ عبداللہ نے دونوں تحریکوں کے سربراہوں کو مکہ بلایا اور کعبے کے سایے میں جنگ بندی کا معاہدہ کرایا مگر جلد ہی صدر محمود عباس نے معاہدہ توڑ دیا اور حماس کی جائز حکومت کو برطرف کر کے اسرائیل نواز عبوری حکومت قائم کردی جس کو فلسطین کے اصل وزیراعظم اسماعیل ہانیہ نے مسترد کردیا، اسرائیل کے کتر بیونت سے جو فلسطین بچ گیا تھا اس کے اب دو حصے ہوگئے، بڑے حصے پر الفتح اور غزہ پر حماس قابض ہے، اس خانہ جنگی سے اسرائیل کو تو تحفظ ملتا جارہا ہے مگر فلسطینیوں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔

گزشتہ مہینے پاکستان میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے آپریشن سائلنس کا نہایت اندوہ ناک واقعہ پیش آیا اور ایک صد سے زیادہ علوم دینیہ کے طلبا و طالبات اور علما کی قیمتی جانیں گئیں، یہ خوں ریزی اور وحشیانہ کارروائی اور مسجد و مدرسے کی پامالی و بے حرمتی حکومت کی کوئی مجبوری نہیں تھی، مذاکرات اور بااثر لوگوں کو درمیان میں لاکر مسئلے کو حل کیا جاسکتا تھا، اگر مسجد و مدرسہ والوں کی انتہاپسندی اور سرکشی اتنی بڑھ گئی تھی کہ انہوں نے متوازی حکومت بنالی تھی، اس بنا پر یہ سخت اقدام ضروری ہوگیا تھا تو کیا اس میں حکومت کی غفلت نہیں تھی جس نے انہیں اتنی چھوٹ دے دی تھی کہ وہ مسجد و مدرسہ کو اپنی باغیانہ سرگرمیوں کا مرکز بناکر امن و قانون کو پامال کرنے لگے تھے، پاکستان اپنے دستور کی رو سے اسلامی مملکت ہے، اس سے اسلامی قانون و شریعت کے نفاذ اور فواحش و منکرات کے انسداد کا مطالبہ غلط نہیں تھا، مگر [illegible] کا طریقہ [illegible] تھا، ضد، غلو اور تشدد سے مطالبات نہیں منوائے جاتے اور نہ زور وقوت سے

برائیاں ختم کی جاسکتی ہیں، اس کے لئے ذہن و کردار سازی کی جاتی ہے اور آئینی، جمہوری اور پرامن طریقے سے رائے عامہ ہموار کی جاتی ہے مگر حکومت کی نیت ٹھیک نہیں، اس نے یہ جارحانہ کارروائی مغربی آقاؤں کی خوش نودی کے لئے کی تھی جس کی شاباشی اسے مل چکی، فوج کشی اور ظلم و تشدد سے وقتی طور پر سکون ہوجاتا ہے مگر آیندہ دبی ہوئی چنگاریاں بہت زور شور سے بھڑکتی ہیں، مشرف صاحب کے اس طرح کے ناروا اقدامات سے ان کی مشکلات بڑھتی جارہی ہیں۔

مسجدوں اور مدرسوں کے متعلق ہندوستان کی حکومت کا رویہ بھی بہت نامناسب ہے، اسی کی شہ پاکر شرپسندوں اور فرقہ پرستوں نے صدیوں پرانی بابری مسجد ڈھادی تھی جس کے غم سے مسلمان نڈھال ہیں، حیرت ہے کہ ۱۵ برس گزرنے کے بعد بھی مسجد گرانے والوں کو سزا نہیں ملی، یہی وجہ ہے کہ ایک مسجد گرانے سے ان کا دل نہیں بھرا ہے اور ان کے نشانے پر اور بھی کئی مسجدیں ہیں، حکومت کو بھی مسجدوں اور مدرسوں کا وجود گوارا نہیں، حال میں انجمن وکیل قوم پنجابیان کے اعزازی جنرل سکریٹری محمد ذکی باڑی کے خط سے معلوم ہوا کہ دہلی کی قدیم مسجد حاجی فخر الدین بہ شمول اپنی جائدادوں کے بہ ذریعہ Acquire Lac(N) کی جارہی ہے کیوں کہ انتظامیہ کا 6 لین کی فلائی اوور یا Grade Separator بنانے کا منصوبہ ہے، جب کہ مسلمانوں کے نزدیک جہاں ایک بار مسجد بن جاتی ہے، اسے کبھی وہاں سے ہٹایا نہیں جاسکتا اور نہ وقف شدہ چیز کی بیع و فروخت ہوسکتی ہے، خود حکومت ہند بھی عبادت گاہوں کو ۱۹۴۷ء کی پوزیشن میں برقرار رکھے جانے کا اعلان کرچکی ہے، انجمن وکیل قوم پنجابیان دہلی ایک رجسٹرڈ سوسائٹی ہے جو وقف اور مسجد حاجی فخر الدین واقع نواب گنج آزاد مارکیٹ پل بنگش کی ۱۹۷۰ء سے متولی ہے، مسجد اور اس کی جائدادوں کو حاجی فخر الدین (پٹنہ والے) نے ۱۹۱۹ء میں وقف کیا تھا اور ۱۹۰۱ء میں مسجد تعمیر کی تھی، اس لئے دلی انتظامیہ کا اقدام غلط اور آئین ہند میں دی گئی ضمانت کے خلاف ہے، اس لئے حکومت کو فلائی اوور کا نقشہ تبدیل کردینا چاہیے اور تمام مسلمانوں اور انصاف پسند لوگوں کو انجمن وکیل قوم پنجابیان کی حمایت کرنی چاہیے۔

سیاست کی دنیا میں واقعات کی صحیح تصویر سامنے نہیں آنے دی جاتی، شراوستی ضلع کے دھنی ڈیہہ گاؤں میں جو شرم ناک واقعہ پیش آیا، اس کی حقیقت بھی سیاست کی بھول بھلیوں میں گم ہوجانا چاہتی ہے، اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک مسلمان لڑکا ایک برہمن لڑکی کو لے کر فرار ہوگیا، ایسے مواقع پر عموماً شرپسند لوگ قرب و جوار کے اکثریتی فرقہ کے لوگوں کو جمع کر کے مسلم آبادی پر دھاوا بول دیتے ہیں

اور قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک شخص کے جرم کی سزا اس کی پوری قوم کو دینا چاہتے ہیں، اقلیتی فرقے والے اپنی ناواقفیت، کم زوری اور تعلیمی و معاشی پس ماندگی کی وجہ سے کوئی قانونی کارروائی نہیں کرتے اور پولس ان کو اس کا موقع بھی نہیں دیتی، اس گاؤں میں ۱۱ بجے دن کو اکثریتی فرقے کے لوگوں نے مسلم گھروں کو لوٹا، توڑ پھوڑ کی اور ۸ سے ۷۰، ۸۰ سال کی عورتوں کو برہنہ کر کے دوڑایا اور ان کی آبروریزی کی، یو-پی کے ایک وزیر کے بھائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بلوائیوں کی قیادت کررہے تھے، یہ رپورٹ سماج وادی پارٹی کے ایک وفد کی ہے، جس کی تصدیق مسلم رہنماؤں اور تنظیموں نے بھی کی ہے مگر سرکاری حلقے اور حکم راں جماعت واقعات کی پردہ پوشی بلکہ سرے سے ان کا انکار کررہی ہے، اس طرح اصل حقیقت مشتبہ اور گڈمڈ ہوگئی ہے، وزیر اعلا نے اس دعوے کے ساتھ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی کہ وہ ریاست سے غنڈہ اور مافیا راج ختم کردیں گی، ان کا فرض ہے کہ پارٹی مفاد سے بالاتر ہو کر واقعے کی غیر جانب دارانہ تحقیق کرائیں، تاکہ مجرم کو قرار واقعی سزا ملے مگر ان کی خاموشی معما ہوگئی ہے جب کہ الہ آباد میں انہوں نے بڑی مستعدی سے کام لیا تھا۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے نئے تعلیمی سال کے قرض وظیفے دینے کے لیے ملک کے ان مسلم طلبا و طالبات سے درخواستیں طلب کی ہیں جنھوں نے دسواں درجہ کم از کم ۸۰ فی صد یا بارہواں درجہ یا اس کا مساوی امتحان ۷۵ فی صد یا گریجویشن یا پوسٹ گریجویشن ۷۰ فی صد نمبروں سے پاس کیا ہے، اپنی اپنی ریاستوں کے سب سے زیادہ نمبر پانے والے طلبا ہی کو نومبر ۲۰۰۷ء میں کسی وقت انگریزی اور معلومات عامہ میں امتحان اور انٹرویو کے لئے سوسائٹی کے خرچ پر دہلی بلایا جائے گا اور بہ ترتیب ۲۵۰-۳۵۰-۵۰۰- اور ۱۲۰۰- روپے ماہانہ وظیفہ دینے کا فیصلہ کیا جائے گا، مستحق وظائف طلبا کو یہ پابند بھی کرنا ہوگا کہ تعلیم مکمل کرنے کے زیادہ سے زیادہ دو سال کے بعد سے وہ قرض کی رقم ماہ بہ ماہ (یا ایک مشت بھی) ان ہی قسطوں میں واپس کرنا شروع کردیں گے جن قسطوں میں وہ ان کو ملی تھی، وہ جامعہ ہمدرد کی ویب سائٹ www Jamia hamdardedu سے درخواست فارم ڈاؤن لوڈ کراسکتے ہیں یا جناب سید حامد سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی تعلیم آباد، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۲ سے خط لکھ کر درخواست فارم منگا سکتے ہیں، بھرے ہوئے فارم ستمبر ۲۰۰۷ تک وصول کیے جائیں گے، اس کے بعد آنے والے فارم پر غور نہیں ہوگا۔

☆☆☆☆☆

مقالات

حضرت ثویبہؓ - رسول اکرم ﷺ کی رضاعی ماں

از:- پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی ☆

زمانہ قدیم سے رضاعت ایک مسلمہ سماجی روایت رہی ہے، کم از کم اسلامی معاشرے میں اسے ہمیشہ سماجی قبولیت، تہذیبی استناد اور مذہبی اور قانونی تحفظ و احترام حاصل رہا ہے، دوسرے معاشرے بھی اس سے خالی نہ تھے، قرآن مجید کی متعدد آیات کریمہ (نساء-۲۳، قصص-۷، ۱۲، نیز بقرہ-۲۲۳، حج-۲، طلاق-۶) اور بہت سی احادیث و روایات سے انسانوں کے مختلف سماجوں میں اس کے رواج کا ثبوت ملتا ہے۔ (بخاری، مسلم وغیرہ کی کتب النکاح کے ابواب رضاعت یا خاص کتاب الرضاع، کتب سیرت و تاریخ اسلامی کے مختلف ابواب، خاکسار کا مضمون "عہد نبوی میں رضاعت" معارف اعظم گڈھ ۱۹۹۶ء، جون ۴۰۵-۴۲۴، جولائی ۵-۲۲)

انبیائے کرام میں حضرت موسیٰ کی رضاعت کا ذکر قرآن مجید نے سورۂ قصص میں کیا ہے، خاتم المرسلین اور سید الانبیا حضرت محمد بن عبد اللہ ہاشمی ﷺ کی رضاعت کا ثبوت حدیث و سیرت سے ملتا ہے، نبوی شرائع اور اسلامی سماجی نظام میں رضاعت کو ایک صحیح، محبت آگیں اور اسلامی رشتہ سمجھا گیا ہے، اسلام کے دین و شریعت میں یہ سماجی نظام اور تہذیبی طریق حضرات ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے زمانہ سے مستحکم تھا، دین ابراہیمی-اسماعیلی کی اور بہت سی سماجی روایات اور اسلامی تہذیبی اقدار کی مانند رضاعت بھی جاہلی عربوں میں آئی، جاہلی عرب میں رضاعت کی سماجی قدر اتنی مستحکم تھی کہ وہ تمام اشراف و طبقات کا ایک طرۂ امتیاز بن گئی تھی حتی کہ غربا بھی اس

☆ ڈائرکٹر شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، ادارۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ۔

کو اپنانے کی کوشش کرتے تھے اور لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی بھی رضاعت ہوتی تھی، ان کو شہر مالوف میں بھی مرضعات (دودھ پلائیوں) کے سپرد کردیا جاتا تھا اور باہر بالخصوص دیہات میں بھی رضاعت کے لئے بھیجا جاتا تھا، جاہلی عرب میں اس کا جتنا چلن تھا شاید کسی اور معاشرہ میں اتنا رواج نہیں رہا۔

رضاعتِ نبوی: عرب جاہلی کی تہذیبی روایت کے مطابق رسول اکرم ﷺ کی رضاعت کا بھی خاص اہتمام کیا گیا تھا، اولین رضاعت کے بارے میں ایک اور مستحکم اور مسلمہ روایت یہ بھی رہی تھی کہ وہ نومولود کی ماں ہی کرتی تھی، رسول اکرم ﷺ کے باب خاص میں بہت وضاحت کے ساتھ آتا ہے کہ ولادت کے بعد والدۂ ماجدہ نے ہی دودھ پلایا تھا، اسلامی راویوں نے اس نکتہ پر بڑا زور دیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے بطن و جوف مبارک میں جانے والی اولین غذا ماں کا دودھ ہی تھی اور اس کے بعد دوسری دودھ پلائی حضرت ثویبہؓ (ث و ی ب ہ) نے آپ ﷺ کو دودھ مکہ میں پلایا تھا اور خاص بدوی اور اصل مرضعہ حضرت حلیمہ سعدیہؓ تھیں جنہوں نے پوری مدتِ رضاعت میں یہ کامل سعادت پائی تھی، بعض دوسری مرضعات عالیہ کا ذکر بھی ملتا ہے اور استقصا نگاروں نے نبوی دودھ پلائیوں کے باب میں بہت سی روایات جمع کرکے ان کی تعداد میں غلو و مبالغہ تک کو روا رکھا ہے، بہرحال اولین مرضعہ حضرت ثویبہؓ ہی تھیں، اس مقالہ میں انہیں خاتون گرامی کے بارے میں ایک تحقیقی تجزیہ پیش کرنا مقصود ہے۔

حضرت ثویبہؓ کے بارے میں ہمارے قدیم و جدید سیرت نگاروں نے بہت کم لکھا ہے، مولانا شبلیؒ نے ایک مختصر فقرہ لکھا ہے کہ "اور دو تین روز کے بعد ثویبہ نے دودھ پلایا"، ان کی سیرت کے جامع گرامی سید سلیمان ندویؒ نے قوسین میں اضافہ کردیا (جو ابولہب کی لونڈی تھی) اور حاشیہ میں بخاری "باب یحرم من الرضاعة مایحرم من النسب" کا حوالہ دے دیا (سیرۃ النبی ۱/۱۷۲)، قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ نے "ایام رضاعت" کو اتنا مختصر کیا کہ حضرت ثویبہؓ کا ذکر ہی نہیں کیا (رحمۃ للعالمین ۱/۴۱)، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے بھی صرف ایک جملہ میں کام تمام کردیا (السیرۃ النبویۃ، ۱۰۰ "ارضعة ثویبة جاریة عمه ابی لهب بضعة ایام")، مولانا صفی الرحمان مبارک پوریؒ نے نسبتاً دو تین جملوں میں بات پوری کی ہے جن میں رضاعت نبوی

کے ساتھ بعض اور رضاعتوں کا ذکر ہے مگر وہ قابل بحث ہے، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور مولانا ابوالاعلی مودودیؒ ان سیرت نگاروں میں ہیں جن کے ہاں کچھ زیادہ تفصیل ہے (الرحیق المختوم، ۵۵، سیرۃ المصطفی ۱/۶۸-۶۹، سیرت سرور عالم ۲/۹۵-۹۶)۔

حضرت ثویبہؓ: رسول اکرم ﷺ کی اولین مرضعہ (دودھ پلائی - رضاعی ماں) کا حق تھا کہ ان پر زیادہ توجہ دی جاتی، حیرت کی بات ہے کہ بے اعتنائی یا کم توجہی کا شکوہ محققین سیرت نگاروں اور جدید تاریخ دانوں سے زیادہ ہے، ہمارے قدیم سیرت نگاروں اور دوسرے صاحبان علم و فضل کی کتابوں، روایتوں اور بحثوں میں کہیں زیادہ مواد ان کے بارے میں ملتا ہے، بلاشبہ بعض جدید سیرت نگاروں نے خاصی روایات نقل کی ہیں اور حضرت ثویبہؓ کے بارے میں قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں مگر روایات کا تجزیہ اور تنقیدی مطالعہ ان کے ہاں بھی مفقود ہے، غالباً اس کی وجہ ان کی اختصار پسندی اور روایت پرستی تھی، ان پر کسی قسم کا الزام عائد کرنا مقصود نہیں ہے لیکن روایات کے تحلیل و تجزیے سے گریز کرنا اور آنکھ بند کرکے روایات نقل کردینا بھی کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے بالخصوص کسی ایک قسم کی روایت پر تکیہ کرکے ایک عوامی قسم کا رویہ اپنا لینا، یہاں ان محترم و مکرم سیرت نگاروں کی تمام بحثوں کا تنقیدی تجزیہ کرنا بھی مطلوب نہیں ہے کیوں کہ ان پر تنقیدی نظر اگلے مباحث میں ڈالی جاتی رہے گی مگر ایک آدھ مثال اس روایت پرستی کی دینی ضروری ہے تاکہ بات مستند ہوجائے۔

مولانا صفی الرحمان مبارک پوری مدظلہ العالی کی اردو کتاب میں ہے "آپ ﷺ کو آپ ﷺ کی والدہ کے بعد سب سے پہلے ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے دودھ پلایا، اس وقت اس کی گود میں جو بچہ تھا اس کا نام مسروح تھا، ثویبہ نے آپ ﷺ سے پہلے حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو اور آپ ﷺ کے بعد ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی کو بھی دودھ پلایا تھا[۶]" (الرحیق المختوم اردو، علی گڑھ ۱۹۸۸ء، ۸۴، بحوالہ تلقیح الفہوم، ص ۴، مختصر السیرۃ شیخ عبداللہ، ص ۱۳)، اپنی اصل عربی تصنیف میں یہی بات عربی میں اولین فقرے میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ لکھی ہے اور یہی حوالے ہیں (الرحیق المختوم، الریاض ۱۹۹۷ء، ص ۵۵)، یہ تمام حوالے بہت متاخر کتابوں کے ہیں اور اصل / قدیم حدیث و سیرت کی کتابوں سے گریز کیا گیا ہے، پھر ان میں تحلیل ہے

اور نہ تجزیہ - اور یہ صرف مولانا مبارک پوری مدظلہ العالی کا معاملہ نہیں ہے، بہت سے روایتی علما اور سیرت نگاروں کا بھی ہے، مولانا علی میاںؒ نے رضاعت ثویبہؓ کے لئے سرے سے کوئی حوالہ ہی نہیں دیا اور قاضی منصور پوریؒ نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔

نام و نسب: سب سے زیادہ حیرت انگیز اور عجیب بات یہ ہے کہ حضرت ثویبہؓ کے نام و نسب پر کوئی بحث نہیں ملتی، نہ قدیم روایات میں نہ جدید مطالعات میں، صرف ان کا نام اور ابولہب بن عبدالمطلب ہاشمی سے ان کا رشتہ ملتا ہے، یہ بھی خاصی فکر انگیز بات ہے کہ حضرت ثویبہ کا نام بھی پورے اسلامی سیرتی و سوانحی ادب میں بے مثال و تنہا ہے، کسی بھی خاتون مکرمہ کا نام ثویبہ نہیں ملتا، ان کے نسب کے بارے میں تو ایک لفظ بھی کسی قدیم روایت میں نہیں آیا ہے، ان کے نام نامی ثویبہ کے حتمی ہونے کی قطعی شہادتیں حدیث و سیرت اور تاریخ اسلامی کی متعدد روایات دیتی ہیں، ان کی تعدادیں تو بہت زیادہ ہے لیکن بنیادی ماخذ حدیث و سیرت بخاری، مسلم، ابن سعد اور واقدی ہی ہیں، بعد کے محدثین کرام اور سیرت نگاروں نے ان ہی سے تمام روایات لی ہیں، لہذا وہ ثانوی مقام و مرتبہ کے ماخذ بن جاتے ہیں۔ (واقدی بحوالہ ابن سعد ۱/ ۱۰۸ - ۱۱۰، بحوالہ ابن سید الناس ۱/ ۴۷-۴۸ بحوالہ بخاری، حدیث: ۵۱۰۱ نیز دیگر، فتح الباری، ۹/ ۱۷۵، ۱۹۸-۱۹۹، مسلم کتاب الرضاع، باب یحرم من الرضاعة ما یحرم من الرحم، حدیث [۱۵] (۱۴۴۹)، نووی، المنہاج ۱۰/ ۲۲ - ۲۳، ابن سعد ۱/ ۱۰۸-۱۱۰۔

حضرت ثویبہؓ کا نسب جس طرح مجہول ہے، اسی طرح ان کے شوہر کا نام و نسب نامعلوم ہے، قدیم و جدید مصادر میں سے کسی نے بھی ان کے شوہر کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے، ممکن ہے کہ کسی کم معروف ماخذ میں ان کا ذکر خیر ہو لیکن ہمیں ابھی تک دست یاب نہیں ہو سکا، بہرحال یہ پوری بحث ابھی تک تحقیق طلب ہی ہے، ان کی اولادوں میں صرف ایک جناب مسروح بن ثویبہؓ کا ذکر ضرور ملتا ہے اور وہ بھی رسول اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے، غالباً کیا، یقیناً جناب مسروح کا ذکر رسول اکرم ﷺ کے ساتھ والدہ ماجدہ کے دودھ میں شرکت کے باعث محفوظ رہ گیا، یہ بھی ایک معجزۂ نبوی ہے کہ اسی کے سبب ان کا نام و نشان تو باقی ہے، ورنہ دوسری اولاد حضرت ثویبہؓ کی مانند وہ بھی صفحۂ ہستی اور صفحۂ تاریخ دونوں سے مٹ گیا ہوتا، اس پر

مزید بحث رضاعت ثویبہؓ کے ضمن میں آئے گی۔

خاندان نبوت سے ربط و تعلق: روایات سیرت کے تنقیدی تجزیے سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ثویبہؓ کا خاندان بنو عبدالمطلب ہاشمی سے تعلق تھا اور گہرا تعلق تھا اور اسی وسیع تر تعلق و ربط نے ان کو رسول اکرم ﷺ کے خاندان سے متعارف کرایا تھا، ماخذ کا اتفاق ہے کہ حضرت ثویبہؓ رسول اکرم ﷺ کے ایک چچا ابولہب بن عبدالمطلب ہاشمی کی ایک باندی رہی تھیں، خاندان ابولہبی سے ان کے رشتہ و تعلق کی نوعیت پر ایک مختصر بحث ذرا بعد میں آتی ہے کیوں کہ اس کی کئی جہات ملتی ہیں، بہرحال ابولہب ہاشمی سے ان کی وابستگی کے سبب رسول اکرم ﷺ کی والدۂ ماجدہ کے پاس ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا، یہ محض قیاس نہیں ہے بلکہ روایات سیرت و حدیث میں اس سے متعلق ایک اہم حقیقت ملتی ہے جو بہت دل چسپ ہے۔

اگر چہ اس کی تفصیل و تشریح نہیں ملتی مگر ایک مختصر فقرے نے اس رشتہ و تعلق کا بھرم قائم کیا ہے، ان کی آزادی کے حوالے سے ذکر خیر ملتا ہے کہ ابولہب ہاشمی نے ان کو اس وقت آزادی عطا کردی تھی، جب حضرت ثویبہؓ نے رسول اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کی بشارت اپنے مالک و آقا کو جا کر سنائی تھی، ''...... وقد أعتقها حين بشرته بولادته ﷺ......'' روایات میں اور دوسری چیزیں بھی ہیں جن کا ذکر بعد میں ان کے آزادی کے وقت و موقع پر آئے گا، مگر اس فقرے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ حضرت ثویبہؓ ولادت نبوی کے وقت جناب آمنہؓ کے پاس موجود تھیں اور ولادت نبوی کے معاً بعد ہی انہوں نے سب سے پہلے رسول اکرم ﷺ کی پیدائش کی خوش خبری اسے جا کر سنائی تھی، اسی اولین خوش خبری کے سبب ابولہب ہاشمی کو اتنی خوشی ہوئی کہ اس نے باندی کو آزادی بخش دی، غلاموں باندیوں کی آزادی کے احوال و عوامل میں سے ایسی ہی خوش خبریاں بھی شامل ہوتی تھیں اور وہ صحیح سماجی روایت بھی ہے، اسی سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ جناب ثویبہؓ رسول اکرم ﷺ اور والدۂ ماجدہ کے پاس آتی جاتی رہتی تھیں اور رضاعت نبوی کے واقعہ سے زیادہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کی رضاعت سے اس کی تصدیق مزید ہوتی ہے۔

رضاعت ثویبہؓ کا تسلسل: حدیث و سیرت کی روایات نے بلاشبہ یہ ثابت کیا ہے کہ جناب ثویبہؓ

نے قریش اور مکہ مکرمہ کے متعدد خاندانوں کے کئی افراد ورجال کی رضاعت کی ذمہ داری سنبھالی اور نبھائی تھی اور یہ مادرانہ خدمت تسلسل کے ساتھ انجام دی تھی، مختلف روایات میں الگ الگ نام واشخاص ملتے ہیں جن کی رضاعت کا فریضہ انہوں نے مختلف اوقات میں ادا کیا تھا، مآخذ کی روایات بسا اوقات ایک ہی سانس اور ایک ہی سلسلہ کلام میں ان کے رضاعی فرزندانِ گرامی کا ذکر کردیتی ہیں، ان سے بالعموم الجھن، ابہام اور انتشار پیدا ہوتا ہے، بالخصوص زمانی اور تاریخی ترتیب کے بارے میں، لہذا تاریخی پس منظر میں ان کا ذکر کرنا ضروری ہے، اس سے بعض محدثین کرام کی توجہات اور بعض سیرت نگاروں کی تاویلات کا بھرم بھی کھل جائے گا، کیوں کہ انہوں نے صحیح تاریخی پس منظر کا لحاظ نہیں کیا ہے۔

۱- رضاعتِ حضرت حمزہؓ: زمانی ترتیب اور تاریخی تنظیم وتوقیت کے اعتبار سے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کی رضاعت ثویبہؓ کا ذکر سب سے پہلے آنا چاہیے، مگر وہ رضاعت نبوی کے ضمن میں بہ طور حاشیہ آتا ہے، بہر حال روایات کا اتفاق ہے کہ خاندان بنو عبدالمطلب قریش میں زمانی اعتبار سے سب سے پہلے حضرت ثویبہؓ نے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کو دودھ پلایا تھا، پھر رسول اکرم ﷺ کی رضاعت کی تھی اور آپ ﷺ کے بعد ایک اور مکی قریشی حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومیؓ کو اپنی رضاعت کا شرف بخشا تھا، ان تینوں رضاعتوں کا ذکر بالعموم ایک ہی روایت میں رضاعت نبوی کے حوالے سے آتا ہے "وکانت ثویبہ، مولاۃ ابی لھب بن عبد المطلب، ارضعت النبی ﷺ ایاماً، قبل ان تاخذہ حلیمۃ، من لبن ابن لھا یقال لہ مسروح، و ارضعت قبلہ حمزۃ بن عبد المطلب، و ارضعت بعدہ ابا سلمۃ بن عبد الاسد المخزومی ......"، ابن سعد ۱/ ۱۰۸-۱۱۰؛ بلاذری ۱/ ۹۴؛ ابن سید الناس ۱/ ۴۷-۴۸؛ حلبی ۱/ ۸۵-۸۸؛ طبری ۲/ ۱۵۷-۱۵۸ پر ایک سند خاص سمیت یہی رضاعت ثویبہ کی روایت ہے جس میں ایک اہم چیز ہے جس پر بحث حضرت ثویبہؓ کے سماجی مقام پر آتی ہے۔

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت ثویبہؓ نے خاندان بنی ہاشم میں سب سے پہلے حضرت حمزہؓ کی رضاعت کی تھی، اس کی تائید دوسرے بیانات، روایات، شواہد اور قرائن وغیرہ سے

بھی ہوتی ہے جن کا ذکر ابھی آتا ہے، اب مسئلہ ہے حضرت حمزہؓ کی رضاعت ثویبہؓ کی ٹھیک ٹھیک توقیت کا، کیونکہ روایات کا اس میں اختلاف ہے، ان کا تعلق حضرت حمزہؓ کی عمر شریف سے ہے کیونکہ اسلامی شریعت اور دین ابراہیمی کی شریعت میں رضاعت کی مدت نومولود کی اولین دوسالہ زندگی تک ہی محدود ہے، دوسال کی عمر سے زیادہ کی مدت قابل لحاظ نہیں۔ (بخاری، کتاب النکاح، باب من قال: لا رضاع بعد حولین ...... (البقرۃ: ۲۳۳) الخ؛ فتح الباری ۹/ ۱۸۳-۱۸۴؛ ابن حجرؒ نے تمام اکابر فقہا کے اقوال اور آیت کریمہ مذکورہ کی تفسیرات بھی نقل کی ہیں، دوسری کتب حدیث سے اسی حکم کی احادیث بھی پیش کی ہیں)

حضرت حمزہؓ کی عمر شریف بھی رسول اکرم ﷺ کی عمر مبارک کے حوالے سے ہی متعین ہوتی ہے اور خوب ہوتی ہے کہ اصل تو وہی معیار حق و عیار تعین ہے "اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست" کا ایک معنی تو یہ بھی ہے، تقابلی تفاوتِ عمروسن کے بارے میں دو اختلافی روایات ملتی ہیں:

(الف) مشہور ومقبول عام روایت تو یہ ہے کہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمیؓ رسول اکرم ﷺ سے عمر میں چار سال بڑے تھے، متعدد ماہرین انساب اور سیرت نگاروں اور سوانح نویسوں نے اسی کو قبول اور بیان کیا ہے: "کان حمزۃؓ ...... اسن من رسول اللہ ﷺ باربع سنین" (ابن سعد، سوم، ۱۰ انے اسی عمر کو قبول و بیان کیا ہے، ابن عبدالبر: الاستیعاب، بحوالہ حلبی ۱/ ۸۵ اور غزوۂ احد ۳/ ۶۲۵ میں شہادت کے وقت ان کی عمر ۵۹ سال بتائی ہیں، بلاذری ۱/ ۷۹ "...... تزوج عبد المطلب ھالۃ بنت اھیب بن عبد مناف بن زھرۃ وھی ام حمزۃ ابن عبد المطلب ولدتہ قبل مولد رسول اللہ ﷺ باربع سنین او نحوھا"؛ بلاذری نے عبدالمطلب ہاشمی اور ان کے فرزند عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی کی شادیوں کو دو الگ الگ زمانوں میں ہونے کی بات کہی ہے جب کہ ابن اسحاق وغیرہ کا عام خیال ہے کہ پدر وفرزند دونوں کی شادیاں ایک ہی مجلس میں ہوئی تھیں، یہ بھی ایک قابل بحث وتحقیق طلب معاملہ ہے۔

(ب) دوسری روایت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ حضرت حمزہؓ کا سن صرف دو سال سن نبوی سے زیادہ تھا "انہ کان اسن من رسول اللہ بسنتین"؛ اسد الغابہ؛ اصابہ ۱۸۲۶۔

ہمارے بعد کے علما و فقہا اور ماہرین کے علاوہ سیرت نگاروں کا معاملہ بھی خاصا دلچسپ

اور کافی معنی خیز ہے، ان کے بھی دو طبقات بن گئے ہیں اور وہ اپنی فکر و پسند کے مطابق ان دو اختلافی تاریخوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دیتے ہیں، دراصل ان کو اپنا ایک خاص نظریہ اور مخصوص مسئلہ ثابت کرنا ہوتا ہے لہذا وہ اپنی پسندیدہ تاریخ کو راجح اور دوسری کو مرجوح قرار دیتے ہیں اور ان کے لئے عقلی دلائل بھی دیتے ہیں، خواہ ان کے نتیجے میں بعض غیر معقول نتائج کیوں نہ نکل آئیں، حضرت حمزہؓ کی عمر اور رسول اکرم ﷺ کے سن شریف سے اس کے دو سالہ/ چار سالہ تفاوت پر ان کی فکری کاری گری بھی کافی معنی خیز ہے اور مطلب انگیز تو وہ ہے ہی۔

بعض متاخر سیرت نگاروں کا زور اس بحث پر ہے کہ حضرت ثویبہؓ نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ حضرت حمزہؓ کو دودھ پلایا تھا، لہذا ان کی عمر دو سال سے زیادہ نہیں ہوسکتی کیوں کہ جناب مسروح بن ثویبہؓ کے دودھ میں یا رضاعت میں شرکت صرف دو سال کے اندر ہی ہوسکتی ہے لہذا حضرت حمزہؓ کی عمر رسول اکرم ﷺ کی عمر مبارک سے صرف دو سال زیادہ تھی، دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ چار سال تک حضرت مسروح کی رضاعت کا دودھ باقی نہیں رہ سکتا تھا لہذا ان کی عمر صرف دو سال زیادہ تھی، امام برہان الدین حلبیؒ (۹۷۵/۱۵۶۷-۱۰۴۴/۱۶۳۴: اصل نام علی بن ابراہیم بن احمد بن علی بن عمر قاہری شافعی ہے لیکن وہ برہان الدین حلبی کے لقب و کنیت سے مشہور ہیں) نے اسی دلیل کے سبب چار سال کے تفاوت والی روایت قبول نہیں کی بلکہ امام ابن عبدالبر کی روایت پر سخت نقد کیا ہے، دو سال عمر کی روایت کو ترجیح دینے والے اور بھی کئی سیرت نگار۔ قدیم و جدید دونوں ہی ہیں۔ (حلبی ۱/۸۵؛ داراحیاء التراث العربی، بیروت (غیر مورخہ)

اس دلیل و منطق کی تردید روایات اور دلائل دونوں سے ہوتی ہے، دراصل اس کی بنیاد ہی غلط ہے، روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت حمزہؓ کو رسول اکرم ﷺ سے قبل دودھ پلایا تھا اور رسول اکرم ﷺ کے بعد حضرت ابوسلمہ مخزومیؓ کو دودھ پلایا، یہ دو زمانوں (زمانین) کا معاملہ نہیں ہے جیسا کہ امام حلبی وغیرہ کو سمجھنے میں زحمت ہو رہی ہے بلکہ تین زمانوں کا معاملہ ہے جیسا کہ بعد میں مزید بحث آتی ہے، پھر جس روایت کی بنا پر رضاعت ثویبہؓ میں حضرت حمزہؓ کی رسول اکرم ﷺ کی رضاعت میں شرکت کی بنیاد اٹھائی گئی ہے، وہ بات اور روایت ہی دوسری ہے، وہ دراصل رسول اکرم ﷺ کے رضاعی برادر اور رضاعی اخوت کے شرف کا معاملہ ہے جس

میں یہ دونوں بزرگ شریک تھے، اس کا یہ قطعی مفہوم نہیں ہے کہ حضرت حمزہؓ اور رسول اکرم ﷺ کی رضاعت حضرت ثویبہؓ کا زمانہ ایک تھا، حیرت کی بات ہے کہ امام حلبیؒ وغیرہ نے رضاعت ثویبہؓ کے دو مختلف زمانوں کا معاملہ تو اٹھایا مگر حضرت ابوسلمہ مخزومیؓ کی رضاعت کے مختلف یا متفقہ زمانے کی بات نہیں چھیڑی، دوسرے بعض رضاعی برادروں کا تو خیر ان کو اس باب میں علم ہی نہیں تھا اور تھا بھی تو وہ اسے تجزیاتی تناظر میں نہیں لا سکے، ان تمام رضاعتوں پر بحث آگے آتی ہے۔

بہر حال حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمیؓ کی رضاعت حضرت ثویبہؓ کے بارے میں یہ اہم حقیقت سامنے آتی ہے کہ خاندان ہاشمی میں وہ اولین رضاعت ثویبہؓ تھی، خواہ اسے چار سال قبل رضاعت نبوی سمجھا جائے، خواہ دو سال قبل گردانا جائے، اس طرح بالترتیب اس کا زمانہ ۵۶۷ یا ۵۶۹ سنہ عیسوی میں متعین ہوتا ہے اور سیرتی زبان میں عام الفیل سے چار سال قبل یا دو سال پہلے کی ولادت و رضاعت نبوی کا سن عام الفیل ہے، یہ قیاس کرنا کہ حضرت حمزہؓ سے قبل کسی اور ہاشمی یا مکی کو رضاعت ثویبہؓ کے حوالے سے رضاعی اخوت نبوی کا شرف ملا تھا ناممکن ہے کیوں کہ روایات میں اس کا کوئی عندیہ نہیں ملتا، امکان بہرحال ہے لیکن خاصا موہوم، اگر ایسا ہوتا تو کسی نہ کسی شخصیت کے اس طرۂ امتیاز کا حوالہ ضرور آتا جیسا کہ بعد کی بعض شخصیات کے حوالے سے آتا ہے۔

حدیثی مآخذ بالخصوص بخاری، مسلم وغیرہ امہات الکتب میں حضرت حمزہؓ کی رضاعت کا ذکر خیر ان کی دختر نیک اختر حضرت امامہؓ سے رسول اکرم ﷺ کی شادی کی تجویز کے ضمن میں آتا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز حضرت علی بن ابی طالب ہاشمیؓ نے رکھی تھی اور بعض میں تجویز کا ذکر صیغہ مجہول کے ساتھ آتا ہے، جیسا کہ حدیث بخاری ...... ۵۱ میں ہے، آپ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ وہ میرے رضاعی بھائی کی لڑکی ہے" ...... عن ابن عباس قال: قیل للنبی ﷺ: ألا تتزوج ابنة حمزة؟ قال: انها ابنة اخی من الرضاعة ......"

اس حدیث نبوی کے متن میں رضاعی ماں کا واضح ذکر نہیں ہے، شارحین حدیث بالخصوص امام ابن حجر عسقلانیؒ نے اس کی تشریح میں پہلے تو حدیث مسلم نقل کی ہے جو حضرت علیؓ کو بہ طور تجویز کنندہ بتاتی ہے، پھر رضاعی رشتہ کی حرمت اور اس سے حضرت علیؓ کی واقفیت اور عدم آگاہی کے مسئلہ

سے بحث کی ہے اور پھر چند دوسرے مسائل کے بعد رضاعت حمزہؓ کے مسئلہ کی گرہ کھولی ہے، انہوں نے ماہرین نسب قریش کے سرخیل مصعب زبیری کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ حضرت ثویبہؓ تھیں جن کا ذکر اگلی حدیث بخاری-۵۱۰۰۱ میں آیا ہے کہ انہوں نے حضرت حمزہؓ کو آپ ﷺ سے قبل دودھ پلایا تھا اور آپ کے بعد حضرت ابوسلمہ مخزومیؓ کی رضاعت کی تھی، بنت حمزہؓ کے نام کے بارے میں اختلاف علما کا ذکر کیا ہے کہ سات اقوال ملتے ہیں، امامہ، عمارۃ، سلمی، عائشہ، فاطمہ، امۃ اللہ اور یعلی، قول مزی امام میں ان کا ایک نام ام الفضل بھی ملتا ہے لیکن وہ بہ قول ابن بشکوال ان کی کنیت تھی جیسا کہ ظاہر ہے، (فتح الباری ۹/ ۱۷۵-۱۷۸) جمہور سیرت نگاروں نے ان کے نام میں امامہؓ ہی کو ترجیح دی ہے بلکہ اسی نام سے ان کا تذکرہ لکھا ہے۔ (ابن سعد ۸/۳ومابعد: ''...... وامامة بنت حمزة وامها سلمی بنت عميس، اخت اسماء بنت عميس الخثعمية ......'')

یہ بات خاصی اہمیت کی حامل ہے کہ احادیث بخاری و مسلم وغیرہ میں بالعموم حضرت ثویبہؓ کی رضاعت حمزہؓ کی صراحت نہیں ملتی ہے، اگرچہ رسول اکرم ﷺ کے رضاعی بھائی ہونے کی شہادت زبان نبوی سے ملتی نظر آتی ہے، حضرت ثویبہؓ کی رضاعتِ حمزہؓ کا ذکر سیرتی روایات و اخبار پر مبنی ملتا ہے حتی کہ شارحین حدیث کو بھی ان ہی روایات پر تکیہ کرنا پڑا۔

۲-ابوسفیان بن حارث ہاشمیؓ کی رضاعت: امام حلبیؒ نے حضرت ثویبہؓ کی رضاعت اکابر کے تسلسل کے ضمن میں ایک اور نئی بات کہی ہے، ان کا واضح بیان ہے کہ حضرت ثویبہؓ نے حضرت حمزہؓ کی رضاعت کی، پھر حضرت ابوسفیان بن حارثؓ کو دودھ پلایا جو آپ کے ابن عم تھے، پھر رسول اکرم ﷺ کی رضاعت کی سعادت پائی اور پھر حضرت ابوسلمہؓ کو دودھ پلایا'' ...... فقد ارضعت ثويبه حمزة، ثم اباسفيان ابن عمه الحرث، ثم رسول الله ﷺ، ثم اباسلمة ......'' (۱/ ۸۵)، اس طرح تسلسل سے چار اکابر بنی ہاشم کی رضاعت ثویبہؓ کا ذکر ملتا ہے، اگرچہ موخر الذکر مادری نسبت سے ہاشمی تھے۔

حضرت ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمیؓ کے والد حارث اپنے والد ماجد عبدالمطلب کے فرزند اکبر تھے لیکن اپنے والد گرامی کی زندگی ہی میں انتقال کر گئے تھے، ان کا انتقال

عام الفیل سے پانچ سال قبل ہوگیا تھا یعنی ۵۶۶ء کے قریب، اس وقت ان حارث ہاشمی کے بڑے فرزند ربیعہ بن حارث ہاشمی تھے جو دو سال کے تھے اور ان کی عمر رسول اکرم ﷺ سے سات سال زیادہ تھی، ماہرین نسب و سیرت کے مطابق حضرت ابوسفیان بن حارث ہاشمی رسول اکرم ﷺ کے ہم عمر بھی تھے اور مشابہ بھی، مولف سیرت شامی (محمد بن یوسف، م ۹۴۲/ ۱۵۳۵) نے وضاحت کی ہے کہ حضرت ثویبہؓ نے رسول اکرم ﷺ سے پہلے آپ کے ابن عم ابوسفیان کی رضاعت بھی کی تھی۔ (حلبی، ۱/ ۸۵: ''...... وفی السيرة الشامية ...... وقد كانت ارضعت قبله اباسفيان ابن عمه ﷺ الحرث وفی كلام بعضهم كان تربا له وكان يشبهه ......'' ۱/ ۵۳۹ رسول اللہ ﷺ کے مشبہین میں ان کا ذکر کر کے ان کا نام مغیرہ لکھا ہے نیز بلاذری ۱/ ۷۸-۸۰ برائے نسب و سوانح حارث بن عبدالمطلب ہاشمی)

بلاذری اور بعض دوسرے سیرت نگاروں نے حضرت ابوسفیان بن حارث ہاشمیؓ کو رسول اللہ ﷺ کا رضاعی بھائی تو مانا ہے مگر حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی رضاعت اتفاقی کے رشتہ سے اور یہ روایت بلاذری مجروح انداز سے بیان کی گئی ہے'' ويقال ان اباسفيان كان اخا النبی ﷺ من الرضاع ارضعته حليمة اياماً ''۔ (بلاذری ۱/ ۳۶۱؛ اسد الغابہ ۵/ ۲۱۳: ''...... وكان اخا النبی ﷺ من الرضاعة ارضعتها حليمة بنت ابی ذؤيب السعدية ......'')

۳-رسول اکرم ﷺ کی رضاعتِ ثویبہؓ: زبان رسالت مآب ﷺ سے خود ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ثویبہؓ نے آپ ﷺ کو دودھ پلانے کا شرف پایا تھا، دوسری احادیث و روایات سیرت اس حقیقت کو مزید ثابت کرتی ہیں اور اسے ایک حقیقت واقعہ میں تبدیل کر دی ہیں، لہذا ابن اسحاق/ابن ہشام کی سیرت نبوی کی تحقیق کرنے والے مرتبین گرامی کی مانند رضاعت ثویبہؓ کو ایک مرجوح روایت یا ضعیف حدیث بیان کرنے والوں کا طریقہ اور انداز بے جا تقشف اور غیر محتاط رویے کے ضمن میں آتا ہے۔ (ابن ہشام، السيرة النبوية، مرتبہ مصطفیٰ السقاء، ابراہیم الابیاری، عبدالحفیظ شبلی، قاہرہ ۱۹۵۵ء، ۱/ ۱۶۱، حاشیہ: ۶ میں رضاعت حضرت ثویبہؓ کو لفظ '' ویقال '' سے بیان کیا ہے جو اس کی تضعیف و مرجوحیت کی علامت ہے)

بخاری اور مسلم اور بعض دوسری کتب احادیث میں متعدد روایات بیان کرتی ہیں کہ

رسول اکرم ﷺ نے اپنے بیان وحی آثار میں فرمایا کہ "مجھے ...... ثویبہ نے دودھ پلایا تھا- ارضعتنی ...... ثویبہ"، یہ روایات واحادیث بالعموم رضاعت کی حرمت کے باب میں آئی ہیں لہذا ان میں رسول اکرم ﷺ کے ایک اور رضاعی برادر حضرت ابوسلمہ مخزومیؓ کا بھی حوالہ ہے، پورا متن ہے" ...... ارضعتنی وا باسلمة ثویبة ......" امام بخاری نے حسب دستور اس کے کئی اطراف دیئے ہیں (بخاری، کتاب النکاح، باب یحرم من الرضاعة مایحرم من النسب، حدیث: ۵۱۰۱؛ اطراف حدیث: ۵۱۰۶، ۵۱۰۷، ۵۱۲۳، ۵۳۷۲؛ فتح الباری ۱۷۵، ۱۹۸-۱۹۹، ۲۲۰ ومابعد نیز دیگر جلدیں؛ مسلم، کتاب الرضاع، باب یحرم من الرضاعة مایحرم من الرحم؛ حدیث [۱۵] (۱۴۴۹) نیز (۱۶)؛ نووی المنہاج ۱۰/ ۲۲-۲۳؛ ابوداود، کتاب النکاح، باب مایحرم من الرضاعة مایحرم من النسب، حدیث: ۲۰۵۶ نیز فتح الباری ۹/ ۱۸۰: امام طبرانی کی روایت برائے رضاعت حضرت ابوسلمہ مخزومیؓ "ان اباها اخی من الرضاعة")۔

مدتِ رضاعتِ نبوی ﷺ: کتب سیرت میں رسول اکرم ﷺ کی رضاعت ثویبہؓ کی مدت کا ایک اہم مسئلہ بھی اٹھایا گیا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی اصل رضاعت تو حضرت حلیمہ سعدیہؓ نے اپنے علاقے میں کی تھی، ظاہر ہے کہ حضرت والدہ ماجدہ نے یا ان کے بعد حضرت ثویبہؓ نے چند دنوں تک ہی اس کارِ سعادت کو انجام دیا تھا، جیسا کہ روایات میں بالعموم اسے "ایاما" سے تعبیر کیا گیا ہے، ان ایام سعادت کی بہرحال تعیین ان میں نہیں ملتی، بعد کے سیرت نگاروں اور محققوں نے آپ ﷺ کی والدہ کے ایام رضاعت کی مدت کی تعیین کی ہے اور مختلف اقوال اس ضمن میں ملتے ہیں، امام حلبیؒ کی تحقیق کے مطابق ایک قول یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ کی ماں نے رسول اکرم ﷺ کی رضاعت صرف نو دن کی تھی، قضاعی کی "عیون المعارف" میں ہے کہ سات دن کی تھی، امتاع مقریزی میں ہے کہ والدہ ماجدہ نے سات ماہ تک دودھ پلایا تھا، پھر حضرت ثویبہؓ نے بہت تھوڑے دنوں تک رضاعت کی تھی: "ثم ارضعته ثویبة ایاما قلائل" (۱/ ۸۸)، اس بحث میں بھی رضاعت ثویبہؓ کے قلیل دنوں کی تعداد کا ذکر یا تعیین نہیں ملتا ہے، آپ ﷺ کی والدہ حضرت آمنہ کی رضاعت کا تعیین ضرور ملتا ہے جن میں

سے سات ماہ رضاعت والدہ کا خیال صحیح نہیں ہے۔

ان تمام روایات کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت ثویبہؓ نے رسول اکرم ﷺ کی رضاعت کا کام آپ ﷺ کی ابتدائی رضاعت کے بعد سنبھالا تھا اور حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی اصل اور مستقل رضاعت تک اسے سنبھالے رکھا تھا، وہ مدت بہرحال مختصر تھی اور جن روایات میں چند دنوں کا ذکر آتا ہے وہ صحیح معلوم ہوتے ہیں، ان پر شبہ کی کوئی وجہ نہیں، بہرحال رضاعت کی مدت مختصر یا طویل ہونا اتنا اہم نہیں ہے جتنا رضاعت کا معاملہ کہ اسی سے نسبت وشرف، رضاعی رشتہ کی حرمت اور حضرت ثویبہؓ کی فضیلت ومرتبت کا معاملہ طے ہوتا ہے جو اصل مرکز بحث ہے، یہ عقدہ تقریباً لاینحل ہی لگتا ہے کہ حضرت ثویبہؓ نے رسول اکرم ﷺ کی مستقل رضاعت کیوں نہیں کی، غالباً ان کے پاس حضرت مسروحؓ کے علاوہ ایک اور رضاعی فرزند بھی تھے اور صرف ان دونوں ہی کے لئے ان کا دودھ کافی تھا بیک وقت تین فرزندوں کی رضاعت مشکل تھی۔

۴- حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومیؓ کی رضاعتِ ثویبہؓ: گذشتہ احادیث واخبار سے یہ واضح اور ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی رضاعت کے بعد حضرت ثویبہؓ نے ایک اور صحابی جلیل اور قریشی نوجوان حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومیؓ کی رضاعت کی تھی، اس تیسری رضاعت میں کئی اہم جہات ہیں جن کی وضاحت بہت ضروری ہے:

ایک یہ کہ حضرت ثویبہؓ کے پہلے تینوں رضاعی فرزندوں کا تعلق قریش کے خاندان بنو ہاشم سے ہے، ابولہب ہاشمی کے رشتہ وتعلق سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس نے پہلے اپنے بھائی حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کی ولادت کے بعد خوشی کے مارے اپنی باندی کو ان کی رضاعت کے لئے مقرر کردیا تھا، اگرچہ روایات میں ایسا کوئی قرینہ نہیں ملتا، دوسرے ہاشمی نومولود حضرت ابوسفیان بن حارث ہاشمی کی رضاعت حضرت ثویبہؓ کے بارے میں ایسا کوئی حوالہ نہیں ملتا ہے، چار سال یا دو سال کے بعد ابولہب ہاشمی نے اپنے یتیم - دریتیم - بھتیجے حضرت محمد بن عبداللہ ہاشمی ﷺ کی ولادت کے بعد دوبارہ مسرت وانبساط کے ساتھ پھر اپنی باندی حضرت ثویبہؓ کو رضاعت نبوی کے لئے متعین کردیا تھا۔

دوسری اہم جہت یہ ہے کہ حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسدؓ کی رضاعت کے لئے حضرت ثویبہؓ

کی خدمات کیوں کر حاصل کی گئیں، وہ تو ہاشمی نہ تھے بلکہ مخزومی تھے، ظاہر ہے کہ ابولہب ہاشمی کی مرضی کے بغیر وہ رضاعت نہیں کرسکتی تھیں، حضرت ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد مخزومیؓ کے باب میں بھی ہاشمی نسبت ملتی ہے اور وہ مادری ہے، ان کی والدہ ماجدہ برّہ بنت عبدالمطلب ہاشمی تھیں اور وہ ابولہب ہاشمی کی بہن تھیں، اگرچہ وہ دوسری ماں فاطمہ بن عمرو مخزومی سے تھیں، اس ضمن میں دو باتیں بہت اہم ہیں، جناب برہ بنت عبدالمطلب ہاشمی رسول اکرم ﷺ کے والد ماجد عبداللہ اور ان کے دو حقیقی بھائیوں زبیر اور ابوطالب کی حقیقی بہن تھیں، جب کہ ابولہب ہاشمی کی ماں لُبنیٰ بنت ہاجر خزاعی تھیں مگر جناب برہ مخزومی خاندان میں بیاہی گئی تھیں، بہرحال مخزومی ہونے کے باوجود حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسدؓ ابولہب کے بھانجے تھے اور غالباً اسی رشتے کے لحاظ سے ان کی رضاعت کے لئے ماموں نے حضرت ثویبہؓ کو از راہِ مسرت مقرر کیا تھا مگر ان کی یہ تقرری عرب اور قریشی روایات کے خلاف جاتی ہے کہ ان کے مطابق رضاعت و پرورش پدری خاندان کرتا تھا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خاکسار کی کتاب: عبدالمطلب ہاشمی - رسول اکرم ﷺ کے دادا، دہلی ۲۰۰۰؛ لاہور ۲۰۰۵ء، ۴۴-۴۵؛ اسد الغابہ ۳/ ؛ اصابہ نمبر ۴۷۸۳؛ بلاذری ۱/ ۸۸، ۲۰۷، ۴۲۹ وغیرہ)

وقت و مدت رضاعتِ حضرت ابوسلمہ مخزومیؓ: تیسری یا ایک اور جہت اس رضاعت کی یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے کتنے عرصے بعد حضرت ثویبہؓ نے حضرت ابوسلمہ مخزومیؓ کو دودھ پلایا تھا، حضرت حمزہ ہاشمیؓ کے بارے میں جس طرح چار سال یا دو سال قبل کی صراحت ملتی ہے، ویسی کوئی صراحت حضرت ابوسلمہؓ کی رضاعت کے بارے میں نہیں ملتی، محققین سیرت و حدیث نے اس معاملہ پر زیادہ تر سکوت کو ترجیح دی ہے، بہرحال حضرت ابوسلمہ مخزومیؓ کی عمر کی تعیین کے ساتھ اس کا جواب بھی حاصل کیا جاسکتا ہے لیکن مآخذ سیرت و حدیث میں بالعموم ان کی عمر و سن کے بارے میں خاموشی ہی ملتی ہے، یہی صورت حال حضرت ابوسفیان بن حارث ہاشمی کی دوسری رضاعت حضرت ثویبہؓ کے باب میں نظر آتی ہیں، ان کے ہم عمر نبوی ہونے کی روایت سے خیال ہوتا ہے کہ وہ رسول اکرم ﷺ سے کچھ قبل حضرت ثویبہؓ کی رضاعت میں دئے جاچکے تھے لہذا رسول اکرم ﷺ کی رضاعت ثویبہؓ عارضی رہی۔

رضاعت حضرت جعفر بن ابی طالبؓ: مورخ یعقوبی (احمد بن ابی یعقوب، بعدم ۳۱۵/ ۹۲۷)

نے اس باب میں ایک نئی خبر فراہم کی ہے، انہوں نے مذکورہ بالا تین ہاشمی کے ساتھ ساتھ چوتھا نام حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی کا حضرت ابوسلمہ سے قبل بڑھایا ہے "فکان اول لبن شربة بعد امه لبن ثويبة مولاة ابى لهب وقد ارضعت ثويبة هذه حمزة بن عبد المطلب و جعفر بن ابى طالب وابا سلمة بن عبد الاسد المخزومى ......"۔ (تاریخ یعقوبی، ۲/ ۹)

حضرت جعفر بن ابی طالبؓ رسول اکرم ﷺ سے عمر میں تقریباً بیس سال چھوٹے تھے جیسا کہ ماہرین کا بیان ہے، ان کی پیدائش اور رضاعت ثویبہ کا زمانہ ۵۹۱ء کا واقعہ ہے جب رسول اکرم ﷺ بیس سال کے جوانِ رعنا اور قریش کی ایک نمایاں شخصیت بن چکے تھے، اسی طویل عرصے میں حضرت ثویبہؓ ایک عظیم الشان مرضعہ کی حیثیت سے نمایاں نظر آتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن جحش اسدی خزیمیؓ کی رضاعت ثویبہؓ: سیرت کی ایک ہی روایت میں رسول اکرم ﷺ کے دو رضاعی برادروں - حضرات حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی اور ابوسلمہ عبداللہ ابن عبدالاسد مخزومیؓ کا ذکر رضاعت ثویبہؓ کے حوالے سے مجموعہ طور سے آتا ہے، یعقوبی کی ایک شاذ روایت میں مذکورہ بالا تینوں فرزندان رضائی کے ساتھ ایک اور رضاعی فرزند حضرت جعفر ابن ابی طالب کے ذکر کی وجہ سے ان کی تعداد چار ہوجاتی ہے، بعض انفرادی روایات سیرت اور احادیث نبوی میں ان کی انفرادی رضاعت ثویبہؓ کا تائیدی ذکر خیر بھی ملتا ہے، اسی طرح بعض اور روایات و احادیث میں حضرت ثویبہؓ کے بعض اور رضاعی فرزندوں کا ذکر بھی خاص اہتمام سے کیا گیا ہے، ان میں سے ایک حضرت عبداللہ بن جحش اسدی خزیمیؓ بھی ہیں، جدید سیرت نگاروں میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے کہ "ابن سعد اور ابن ہشام کا بیان ہے کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عبداللہ بن جحشؓ (ام المومنین حضرت زینب کے بھائی) نے بھی اسی (ثویبہؓ) کا دودھ پیا تھا، اس لئے یہ حضرات حضور ﷺ کے رضاعی بھائی تھے"، (سیرت سرور عالم ۱/ ۹۵-۹۶؛ مولانا محترم نے دونوں مآخذ کے باقاعدہ حوالے نہیں دئے ہیں، نہ ان کے مرتبین کرام نے) ابن ہشام کے مرتبین کرام نے بھی اسی طرح حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی رضاعت ثویبہؓ کا ذکر کیا ہے اور اپنے مراجع میں مولانا مودودی کی مانند عمومی حوالہ مآخذ دیا ہے اور اس میں کئی اور کتابوں کا ذکر ہے،

جیسے طبری، الروض الانف، الاستیعاب، شرح المواہب" (ابن ہشام ۱/۱۶۱ حاشیہ محققین -۶)،
امام سہیلی کا بیان بہت اہم ہے: "وارضعته – عليه السلام – ثويبة قبل حليمة ،
وارضعته و عمه حمزة و عبد الله بن جحش ......" الخ۔

حضرت عبداللہ بن جحشؓ کا پدری نسب تو بنوخزیمہ کے خاندان بنواسد سے تھا کیوں کہ ان کے والد جحش بن رياب براء اسدی کا اسی سے تعلق تھا لیکن وہ مکہ مکرمہ میں آکر بس گئے تھے اور بنوامیہ بن حرب / بنوعبدمناف کے حلیف بن گئے تھے اور شادی بنوہاشم میں کی تھی، ان کی زوجہ اور حضرت عبداللہ بن جحش اسدی کی والدہ رسول اکرم ﷺ کی ایک دوسری پھوپھی حضرت امیمہ بنت عبدالمطلب ہاشمی تھیں، اس لحاظ سے وہ مادری نسب پر ہاشمی بھی تھے، غالباً اسی رشتہ کے سبب بنوہاشم میں ان کا مقام ومرتبہ تھا اور وہ بھی ابولہب ہاشمی کے ایک اور بھانجے لگتے تھے، ان کی رضاعت ثویبہؓ کے بارے میں کسی نے بھی ابولہب کی رشتہ داری وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہے، ظاہر ہے اس کا انتظام ان کے والد نے کیا تھا۔ (بلاذری ۱/۸۸ وغیرہ نیز "عبد المطلب هاشمی......"؛ اسدالغابہ ۳/ ؛اصابہ نمبر ۴۵۸۳)

رضاعتِ حضرت ثویبہؓ کا مقام ومرتبہ: حضرت ثویبہؓ کی سعادت وشرف کے لئے کافی تھا کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کی رضاعت کی تھی لیکن سماجی اعتبار سے اور تاریخی پس منظر میں یہ حقیقت اور بھی اہم ہو جاتی ہے کہ انہوں نے عام روایات سیرت وحدیث کے مطابق کم از کم چار پانچ اکابر قریش اور یعقوبی کی شاذ، جو ایسی شاذ بھی نہیں ہے، روایت کے مطابق چھ فرزندان قریش کی رضاعت کا فریضہ انجام دیا تھا، زمانی توقیت کے لحاظ سے ان کی رضاعت کم از کم چار زمانوں پر مشتمل نظر آتی ہے:

☆ سب سے پہلے معلوم روایات کے مطابق انہوں نے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمیؓ کی رضاعت کی تھی، وہ ابولہب ہاشمی کے چھوٹے بھائی تھے اور عمر میں ان کے فرزند کے برابر۔ رضاعت کا یہ زمانہ رسول اکرم ﷺ سے چار سال قبل کا ٹھہرتا ہے یعنی ۵۶۷ء کے قریب۔

☆ رضاعت ثویبہؓ سے مستفید ہونے والے دوسرے ہاشمی حضرت ابوسفیانؓ مغیرہ بن حارث بن عبدالمطلب تھے، وہ ابولہب ہاشمی کے بھتیجے تھے کہ ان کے سب سے بڑے بھائی

حارث مرحوم کے فرزند تھے، وہ رسول اکرم ﷺ کے ہم عمر (تقریباً) بتائے جاتے ہیں لیکن ان کی رضاعت ثویبہ کا زمانہ حضرت حمزہؓ کے بعد اور رسول اللہ ﷺ سے پہلے کا بتایا گیا ہے، بہرحال اس کا امکان ہے کہ ان کی رضاعت حضرت ثویبہؓ نے رضاعت نبوی کے ساتھ کی ہو۔

☆ تیسرے ہاشمی رضاعی فرزند حضرت ثویبہؓ رسول اکرم ﷺ تھے اور وہ بھی ان کے چچا ابولہب ہاشمی کے محبوب اور یتیم بھتیجے تھے، آپ ﷺ کی رضاعت کا زمانہ پہلے دو ہاشمی حضرات کے بعد کا ہے اور ۵۷۱ء میں ولادت نبوی کے معاً بعد یعنی ۱۲/ ربیع الاول عام الفیل کے بعد ایک دو ماہ کا - رسول اکرم ﷺ نے حضرت ثویبہؓ کے فرزند حضرت مسروحؓ کے دودھ میں شرکت کی تھی۔

☆ چوتھے رضاعت ثویبہؓ سے مستفید ہونے والے حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومیؓ تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی برہ بنت عبدالمطلب ہاشمی کے فرزند اور اس رشتہ سے ابولہب ہاشمی کی بہن کے لخت جگر اور خود ان کے بھانجے تھے، ان کے بارے میں یہ وضاحت سے آتا ہے کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے بعد حضرت ثویبہؓ کا دودھ پیا تھا کیوں کہ وہ رسول اکرم ﷺ سے کافی چھوٹے تھے۔

☆ حضرت ثویبہؓ کے پانچویں معلوم رضاعی فرزند حضرت عبداللہ بن جحش اسدیؓ تھے جو اگرچہ قریشی تھے، تاہم رسول اکرم ﷺ کی دوسری پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب ہاشمی کے فرزند اور اسی رشتہ سے ابولہب ہاشمی کے دوسرے بھانجے تھے، ان کی رضاعت بھی رسول اکرم ﷺ کے بعد ہوئی تھی۔

☆ عمر وزمانے کے لحاظ سے سب کے بعد غالباً حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمیؓ نے حضرت ثویبہؓ کا دودھ پیا تھا، وہ روایات کے مطابق رسول اکرم ﷺ سے قریب بیس سال چھوٹے تھے لہذا ان کی رضاعت ثویبہؓ کا زمانہ ۵۹۱ء کے قریب ٹھہرتا ہے۔ (بلاذری ۱/۱۹۸ کے مطابق ۸/ ۶۳۰ میں غزوہ موتہ میں شہادت کے وقت ان کی عمر چالیس برس کے آس پاس تھی؛ نیز اصابہ ۱۱۶۶؛ اسدالغابہ وغیرہ)

یوں رضاعت ثویبہؓ کے پانچ زمانے / ادوار بنتے ہیں کہ ان پانچوں فرزندوں نے الگ

الگ زمانے میں ان کا دودھ پیا تھا مگر حضرت ابوسفیان مغیرہ بن حارث ہاشمیؓ کو رسول اکرم ﷺ کا ہم عمر اور معاصر دودھ شریک بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے، اس طرح حضرت مسروحؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے کچھ قبل وہ بھی اپنی رضاعی ماں کے دودھ سے مستفید ہوئے تھے، حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمیؓ کی رضاعت کو شامل کرنے سے چھ مختلف زمانے بن جاتے ہیں۔

امام ابن عبدالبر، امام حلبی وغیرہ کو صرف دو زمانوں - دو مختلف زمانوں (زمانین) میں رضاعت ثویبہؓ کے مسئلے نے حیران و ششدر کر رکھا تھا جس کی تاویل و توجیہ کے لئے انہوں نے مختلف روایات پر نقد بھی کیا، اب صورت حال یہ ابھر کر آرہی ہے کہ وہ پانچ چھ نہ سہی کم از کم چار مختلف زمانوں میں چھ مختلف فرزندوں کو دودھ پلاتی نظر آتی ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے، اس کی زمانی توقیت اور تاریخی تعیین کرنے کے ضمن میں نظر آتا ہے کہ حضرت ثویبہؓ نے ۵۶۷ء سے ۵۹۱ء تک مختلف زمانوں میں ان اکابر قریش کی رضاعت کی تھی جو ایک خاصا لمبا عرصہ ہے، وہ موجودہ تحقیق کے مطابق لگ بھگ چوبیس پچیس سال کے طویل عرصہ کو محیط ہے، گویا کہ رضاعی ماں کے تمام ایام رضاعت کو لیکن ناممکن نہیں کیوں اس زمانِ دوراں میں ایک کی مختلف اولادیں ہوئی تھیں اور ان کے دودھ میں یہ رضاعی برادر بھی شریک رہے تھے، بدقسمتی سے ان کی اولاد میں سوائے حضرت مسروحؓ کے کسی اور کا نام محفوظ نہیں رکھا جاسکا۔

حضرت ثویبہؓ کی رضاعت کی غالباً اہم ترین جہت یہ ہے کہ انہوں نے چھ چھ اکابر وقت کی رضاعت کی تھی، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ثویبہؓ کو ہی کیوں ان کی رضاعت کے لئے منتخب کیا گیا تھا؟ کیا صرف اس لئے کہ وہ ان رضاعی فرزندوں کے بھائی، چچا یا ماموں کی باندی تھیں؟ یا ہاشمی بھائی، چچا اور ماموں نے اپنی محبت و شفقت میں ان سے اپنے بھتیجوں، بھانجوں اور بھائی کی محبت میں ان کو متعین کیا تھا؟ سوال حضرت ثویبہؓ کے منتخب کئے جانے کا ہے؟ کسی اور کو رضاعت کے لئے کیوں نہیں منتخب کیا گیا؟ ابولہب ہاشمی کی باندیوں کی کمی نہ تھی، نہ دوسری خاندانی مستورات کی۔

ان تمام سوالات اور ان جیسے کئی اور سوالات کا جواب ایک ہی سمجھ میں آتا ہے اور وہ ہے حضرت ثویبہؓ کی شخصیت اور بہ طور مرضعہ ان کی حیثیت، مکہ مکرمہ میں اور غالباً قریش کے

خاندان بنی ہاشم میں وہ ایک مثالی دودھ پلائی سمجھی جاتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ ان کو مختلف زمانوں میں، ایک خاصے طویل عرصے تک فرزندان ہاشمی کی رضاعت کا کام سونپا گیا، ان کے رضاعی فرزندوں کی شخصیات اور ان کے تاریخی پس منظر کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رضاعت کے زمانے میں ہر مرحلہ اور ہر عصر میں ان سے یہ خدمت لی گئی اور نہ صرف لی گئی بلکہ ان ہی کو اس کے لئے منتخب کیا گیا۔

ظاہر ہے کہ حضرت ثویبہؓ کے ان تمام ایام رضاعت میں تمام ہاشمی فرزندوں اور دختروں کی رضاعت کا فریضہ وہ انجام نہیں دے سکتی تھیں، اپنی بطنی اور صلبی اولاد کے ساتھ وہ زیادہ سے زیادہ دو ورنہ صرف ایک ہی کی رضاعت کی خدمت ایک زمانہ رضاعت میں بجالاسکتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ وہ بیک وقت ان میں سے کسی ایک ہی ہاشمی نومولود کی رضاعت کا کام کرسکیں۔

رسول اکرم ﷺ کی رضاعت کے ضمن میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ثویبہؓ نے عارضی مرضعہ کی حیثیت سے یہ خدمت انجام دی تھی، تا آنکہ آپ ﷺ کے لئے ایک باقاعدہ اور مستقل مرضعہ کا انتظام ہوجائے جو حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے انتظام رضاعت سنبھال لینے سے ہوگیا، دوسرے رضاعی فرزندوں میں سے کئی کا یہی معاملہ لگتا ہے، جیسا کہ بعض روایات دعویٰ کرتی نظر آتی ہیں، مثلاً حضرت حمزہؓ کے بارے میں بعض روایات یہ کہتی ہیں کہ ان کی رضاعت مستقلہ بھی بنوسعد بن بکر میں ہوئی تھی اور حضرت ابوسفیانؓ بن حارث بن عبدالمطلب ہاشمی کی اصل مرضعہ تو حضرت حلیمہؓ ہی بتائی جاتی ہیں، اس کا امکان ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی طرح آپ کے بعض رضاعی برادروں کی عارضی رضاعت ہی کا شرف حضرت ثویبہؓ کو ملا ہو اور انہوں نے چند دنوں کی خدمت کے بعد کسی دوسری مستقل مرضعہ کو یہ خدمت سونپ دی ہو مگر ان روایات میں حضرات حمزہؓ اور ابوسفیانؓ کے بارے میں یہ بھی بیان ملتا ہے کہ بنوسعد میں ان کی رضاعت کا معاملہ عارضی تھا۔

دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان چھ معلوم فرزندان رضاعی میں سے کئی کی مستقل رضاعت حضرت ثویبہؓ سے ہی متعلق رہی تھی، حضرت حمزہؓ اولین رضاعی فرزند تھے اور حضرت ثویبہؓ کی رضاعت کا پکا ذکر و ثبوت ہے، بنوسعد بن بکرؓ یا حضرت حلیمہؓ کی رضاعت مستقل کا

ذکر جن روایات میں آتا ہے وہ ذرا مشکوک و مشتبہ سی لگتی ہیں، جس طرح رضاعت ثویبہؓ کے ضمن میں حضرت حمزہؓ کا رسول اکرم ﷺ اور حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومیؓ کی رضاعت ثلاثہ کا اور یعقوبی کی روایت کو شامل کرلیا جائے تو حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی سمیت حضرت ثویبہؓ کی رضاعت اربعہ کا ذکر ملتا ہے، اس طرح حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی رضاعت نبوی کے ضمن میں نہیں ملتا، ورنہ روایت و درایت دونوں کا تقاضا یہ تھا کہ وہ نبوی رضاعت حلیمہؓ کے ضمن میں ان کی دوسری رضاعتوں کا بھی ذکر کرتے، اس کے ساتھ ساتھ حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسدؓ کی کسی دوسری مرضعہ سے رضاعت کا کوئی حوالہ یا ذکر نہیں ملتا، ابھی تک حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمیؓ کی رضاعت کے بارے میں صرف اسی رضاعت ثویبہؓ کا قطعی ذکر مل سکا ہے، یہی صورت حال حضرت عبداللہ بن جحش اسدیؓ کی رضاعت کے بارے میں نظر آتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض ہاشمی اور مکی فرزندوں کی مستقل رضاعت کا کام حضرت ثویبہؓ نے ہی انجام دیا تھا، پھر ان کو محض عارضی اور متبادل مرضعہ کی حیثیت دینے سے عربوں کی جاہلی اور اسلامی سماجی ریت اور ان کے مستقل واقعات و روایات بھی مانع ہیں، کسی ایک ماں نے کبھی ضرورت کے وقت کسی دودھ پیتے بچے کو ضرور ایک آدھ بار دودھ پلا کر عارضی مرضعہ کی حیثیت پالی تھی جیسا کہ حضرت ام الفضل زوجہ حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمیؓ وغیرہ کے بارے میں بعض روایات بتاتی اور ثابت کرتی ہیں یا رسول اکرم ﷺ کی بعض دوسری مرضعات کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے کبھی کبھار یہ خدمت انجام دی تھی، دوسری مثالیں بھی ہیں لیکن حضرت ثویبہؓ ان عارضی مرضعات میں سے نہ تھیں، وہ مکہ مکرمہ کی ایک مسلمہ، محترمہ اور مستقلہ مرضعہ / رضاعی ماں تھیں۔ (باقی)

☆☆☆☆

نسخ: مفہوم، اقسام اور ذرائع علم

از:- مولوی محمد رابع نورانی صدیقی ☆

"اس مضمون کے مندرجات سے بعض اہل علم اور محققین کو اتفاق نہیں ہوگا، اس میں بعض قدیم اہل علم کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے مگر خود قدما اور بعد کے علما بالخصوص حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن مجید میں نسخ کی تعداد بہت کم بتائی ہے، مقالہ نگار نے جن آیات کو ناسخ و منسوخ کی مثالوں میں پیش کیا ہے، وہ دراصل منسوخ نہیں ہیں بلکہ بعد کی آیتوں میں ان کی تبیین و وضاحت کی گئی ہے، اسی طرح سنت بہ معنی حدیث سے قرآن مجید کے نسخ کے، گو احناف قائل ہیں لیکن محققین اسے بھی تسلیم نہیں کرتے، اسی طرح کسی آیت کے منسوخ التلاوت ہونے کے باوجود اس کے حکم کا باقی رہنا عجیب مضحکہ خیز خیال ہے، ان مباحث پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، مقالہ نگار کو اس کا ذکر بھی کرنا چاہیے تھا خواہ تردیداً ہی سہی، اگر کوئی صاحب اس مقالے کے جواب میں مدلل طور پر کچھ لکھیں تو اسے معارف میں شائع کیا جائے گا"۔ (ض)

امام جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ تعالی وجہہ الکریم نے ایک قاضی سے پوچھا هل تعرف الناسخ من المنسوخ یعنی تم ناسخ اور منسوخ کے مابین تمیز کرلیتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں تو آپ نے فرمایا کہ تم خود بھی ہلاک ہوئے دوسروں کو بھی ہلاک کیا (۱)، اسی طرح حضرت حذیفہؓ سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا کہ فتوی دینے کا حق اسی کو ہے جس کو ناسخ اور منسوخ کا علم ہو، لوگوں نے عرض کیا کہ ناسخ اور منسوخ کا علم کس کو ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ

☆ استاذ دار العلوم فیض الرسول براؤں، سدھارتھ نگر یوپی، الہند۔

حضرت عمرؓ کو (۲)۔

اس سے علم ناسخ ومنسوخ کی اہمیت وضرورت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

نسخ کا لغوی اور شرعی معنی: لغت میں نسخ کے کئی معنی آتے ہیں ایک معنی محو کرنا، مٹانا اور زائل کرنا ہے، اسی معنی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَيَنسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ آيَاتِهِ یعنی اللہ شیطان کے القاء وساوس کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیتیں پکی کر دیتا ہے (سورۂ حج آیت ۵۲)

دوسرے معنی تحویل بھی ہیں جیسے تناسخ المیراث یعنی ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف تحویل میراث کرنا اگر کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے تو اسے بھی نسخ کہا جاتا ہے اور نسخت الکتاب اسی معنی میں اور اسی قبیل سے ہے (۳)۔

یہ تو اس کے لغوی معانی ہیں اور اس کا شرعی معنی حکم شرعی کے انتہا کو بیان کرنا ہے، حضرت میر سید شریف جرجانیؒ لکھتے ہیں کہ:

"ان النسخ فی اللغة عبارة عن التبدیل والرفع والإزالة یقال نسخت الشمس الظل ازالته وفی الشریعة ھو بیان انتھاء الحکم الشرعی فی حق صاحب الشرع و کان انتھائه عند الله معلوما الا ان فی علمنا کان استمراره ودوامه وبالناسخ علمنا انتھائه وکان فی حقنا تبدیلا و تغیرا"۔

نسخ کے لغوی معنی تبدیل کرنا، اٹھانا اور زائل کرنا ہے، کہا جاتا ہے کہ سورج نے سایہ زائل کر دیا اور شریعت میں شارع کے اعتبار سے بیان انتہائے حکم ہے، اللہ تعالیٰ کو حکم کی انتہا معلوم ہوتی ہے اور چوں کہ ہم کو اس کے حکم کی انتہا معلوم نہیں ہوتی ہے، اسی لئے ہم اس کو دائمی سمجھتے ہیں اور ناسخ ہی سے ہمیں اس حکم کی انتہا کا علم ہوتا ہے اور یہ ہمارے اعتبار سے حکم سابق کا بدل جانا ہے۔(۴)

اس سلسلے میں حضرت عبداللہ ابن احمد نسفیؒ کی تعبیر بڑی عمدہ ہے فرماتے ہیں کہ:

"تفسیر النسخ لغة التبدیل شریعة بیان انتھاء الحکم الشرعی

المطلق الذی تقرر فی اوھامنا استمراره بطریق التراخی فکان تبدیلا فی حقنا و بیان محضا فی حق صاحب الشرع"۔

نسخ کا لغوی معنی تبدیل کرنا ہے اور شرعی معنی اس حکم شرعی مطلق کے انتہا کو بیان کرنا تراخی کے طور پر جس بارے میں ہم یہ خیال کر چکے ہوتے ہیں کہ یہ حکم دائمی اور مستمر ہے، یہ ہمارے لحاظ سے تو تبدیل ہے مگر شارع کے لحاظ سے بیان خالص کے سوا کچھ نہیں۔(۵)

نسخ کی مثال ایسے ہی ہے جیسے مارنے کے بعد جلانا اور جلانے کے بعد مارنا، صحت کے بعد مرض اور مرض کے بعد شفا، تمول کے بعد غربت اور غربت کے بعد تمول، رات کے بعد دن، دن کے بعد رات، بچپن سے جوانی، جوانی سے بڑھاپا۔

نسخ اور یہود: جمہور کے نزدیک نسخ عقلاً جائز اور نقلاً واقع ہے اور یہودیوں نے اس کا انکار کیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ بداء ہے یعنی تبدیلی رای ہے (جیسے کہ کوئی شخص کسی شئی کے بارے میں پہلے کوئی اور رائے رکھتا ہے پھر رای اول کو غلط سمجھ کر اس کے بارے میں دوسری رای قائم کر لیتا ہے لیکن بداء اللہ کے حق میں محال ہے، اس لئے یہ خیال باطل ہے نسخ بداء ہر گز نہیں یہ تو صرف بیان انتہائے حکم ہے جیسا کہ گذشتہ سطور میں اس کی مکمل وضاحت کر دی گئی ہے، پھر خود یہود اس سلسلے میں ایک رائے پر متفق نہیں بعض کا خیال یہ ہے کہ نسخ عقلاً نقلاً باطل ہے اور بعض کا خیال ہے کہ عقلاً تو جائز ہے مگر نقلاً باطل ہے (۶)۔

یہود کی اس رائے پر یہ اعتراضات وارد ہوتے ہیں:

۱- اگر نسخ جائز نہیں تو شنبہ کے دن دنیوی کام یہودیوں پر کیسے حرام ہوا جب کہ پہلے کی شریعتوں میں وہ جائز تھے؟

۲- حضرت نوحؑ کی شریعت میں تمام حیوان حلال تھے بہت سارے حیوانات حضرت سیدنا موسیٰؑ اور بنی اسرائیل پر کیسے حرام ہو گئے؟

۳- حضرت آدمؑ کی شریعت میں بہن بھائی کا آپس میں نکاح جائز تھا پھر مابعد کی شریعتوں میں یہ کیسے حرام ہو گیا؟ (۷)

احناف کے نزدیک نسخ کی یہ صورتیں جائز ہیں نسخ الکتاب بالکتاب، نسخ الکتاب بالسنة، نسخ السنة بالسنة اور نسخ السنة بالکتاب لیکن امام شافعیؒ کا

نقطۂ نظر یہ ہے کہ نسخ الکتاب بالکتاب اور نسخ السنة بالسنة تو جائز ہے مگر نسخ الکتاب بالسنة اور نسخ السنة بالکتاب جائز نہیں۔

ان کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر قرآن مجید کا نسخ سنت سے جائز ہو تو بے دینوں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ اللہ کے کلام کی تکذیب سب سے پہلے اس کے رسول کر رہے ہیں تو ان کی تبلیغ سے ہم اللہ تعالیٰ پر کیسے ایمان لائیں گے اور اگر سنت کا نسخ قرآن سے جائز ہو تو وہی بے دین افراد کہیں گے کہ رسول اکرم ﷺ کے کلام کی تکذیب سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کر رہا ہے تو ان کے دعویٰ نبوت کی ہم کیسے تصدیق کریں گے؟

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ نسخ تبدیل ہرگز نہیں ہے[1]، وہ شارع کا خالص بیان ہے کہ اس کے حکم کی مدت ہو چکی اور اب حکم ثانی کی مدت شروع ہو رہی ہے جیسا کہ اس کی وضاحت گزشتہ سطور میں ہو چکی ہے تو جب وہ بیان خالص ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے کلام کی انتہا کی مدت بیان فرمادی اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کے کلام کی مدت انتہا کو بیان فرمادیا اور رہا طعن تو یہ بے دین تو ہر ایک میں ایسا کرتے ہیں، لہٰذا اس کو بنیاد بنا کر نسخ الکتاب بالسنة اور نسخ السنة بالکتاب کا انکار مناسب نہیں ہے (۸)۔

نسخ کے اقسام: نسخ کی چار قسمیں ہیں: ۱-نسخ القرآن بالقرآن، ۲-نسخ القرآن بالسنة، ۳-نسخ السنة بالسنة، ۴-نسخ السنة بالقرآن۔

نسخ القرآن بالقرآن: کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

۱-قال اللہ تعالیٰ (وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ) (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۴) یہ آیت کریمہ اس آیت کریمہ سے منسوخ ہے (لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۶)

۲-(وَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ) (سورۂ آل عمران آیت ۱۰۲) یہ آیت کریمہ (فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ) (سورۂ تغابن آیت ۱۶) سے منسوخ ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ محکم ہے۔

---

[1] معارف: پھر قرآنی آیت وَاِذَا بَدَّلْنَا آیَةً مَکَانَ آیَةٍ الخ (النحل) کا کیا مفہوم ہوگا۔

۳-(وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ) (سورۃ النساء آیت ۳۳) یہ آیت کریمہ (وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ) (سورۂ احزاب آیت ۶) سے منسوخ ہے۔

۴-(فَاِنْ جَآءُوْکَ فَاحْکُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ) (سورۂ مائدہ آیت ۴۲) یہ آیت کریمہ (وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ) (سورۂ مائدہ آیت ۴۹) سے منسوخ ہے۔

۵-(اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ) یہ آیت کریمہ اس کے بعد آنے والی آیت سے منسوخ ہے (اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْکُمْ الخ)۔

۶-(اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا) (سورۂ توبہ آیت ۴۱) یہ آیت کریمہ (لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ) (الآیۃ) (لَا عَلَی الَّذِیْنَ اِذَا مَآ اَتَوْکَ لِتَحْمِلَهُمْ (الآیۃ) سے منسوخ ہے اور (وَمَا کَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا کَآفَّةً) (سورۂ توبہ آیت ۱۲۲) سے بھی اس کا نسخ ہوگیا۔

۷-(اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً) (سورۂ نور آیت ۳) یہ آیت کریمہ (وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ) (سورۂ نور آیت ۳۲) سے منسوخ ہے۔

۸-(لَا تَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ) (سورۂ احزاب آیت ۵۲) یہ آیت کریمہ (اِنَّا اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ) (سورۂ احزاب آیت ۵۰) سے منسوخ ہے۔

۹-(اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰکُمْ صَدَقَةً) (سورۂ مجادلہ آیت ۱۲) یہ آیت کریمہ اپنے مابعد کی آیت کریمہ سے منسوخ ہے۔

۱۰-(فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا) (سورۂ ممتحنہ آیت ۱۱) اس کے بارے میں تین اقوال ہیں: ۱-یہ آیت سیف سے منسوخ ہے، ۲-آیت غنیمت سے منسوخ ہے، ۳-یہ منسوخ نہیں محکم ہے۔

۱۱-(قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا) (سورۂ مزمل آیت ۲) یہ سورت کے آخری حصہ یعنی (فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ) سے منسوخ ہے اور اس آیت کریمہ کا مضمون نماز پنج گانہ سے

منسوخ ہے(۹)۔

نسخ القرآن بالسنة: اس قسم کے بارے میں یہ خیال رہے کہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ حدیث کے ذریعہ متن قرآن یا اس کے عام حکم کو کلیۃً منسوخ کردیا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے کسی عام حکم کے بعض افراد کو زبان رسالت سے خاص کرلیا جائے (۱۰)۔

اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ (فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ) (سورۂ نساء آیت ۳) اور زبان رسالت نے اس حکم سے حضرت علیؓ کو خاص کرلیا اور فرمایا کہ (وانی لست احرم حلالا ولا احل حراما ولکن واللہ لا تجتمع بنت رسول اللہ وبنت عدو اللہ مکانا واحدا ابدا) (رواہ ابوداؤد)۔

۲- اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ (اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا) (سورۂ نساء آیت ۱۰۳) اور زبان رسالت نے اس حکم عام سے عرفات کی عصر اور مزدلفہ کی مغرب کو خاص کرلیا اور وقت عصر کی نماز ظہر کے وقت میں اور مزدلفہ میں مغرب کی نماز عشا کے وقت میں ادا فرمائی جیسا کہ اس طویل حدیث میں مذکور ہے جس کو حضرت ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے۔

۳- اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ (وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى) (سورۃ البقرہ ۲۸۲) نبی رحمت ﷺ نے اس حکم عام سے حضرت خزیمہؓ کو خاص فرمایا اور ان کی تنہا گواہی دو مردوں کی گواہی کے برابر فرمادی جیسا کہ اس طویل حدیث میں مذکور ہے جس کو حضرت ابوداؤدؒ نے عمارہ ابن خزیمہ سے روایت کی ہے (۱۱)۔

نسخ السنة بالسنة: کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

۱- نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا (کنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروها) (رواہ ابن ماجہ عن ابن مسعودؓ)

۲- نبی رحمت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ کنت نهيتكم ان لحوم الاضاحی

فوق ثلث ليتسع ذو الطول على ما لا طول له فكلوا ما بدا لكم واطعموا وادخروا (رواہ الترمذی وقال حدیث بریدۃ حدیث حسن صحیح)۔

۳- نبی رحمت ﷺ کا فرمان عالی شان ہے کہ کنت نهيتكم عن الظروف وان ظرفا لا يحل شيئا ولا يحرم كل مسكر حرام، اس حدیث کو امام ترمذیؒ نے بریدہؓ سے روایت کیا ہے اور فرمایا ہے کہ حدیث حسن صحیح ہے۔

نسخ السنة بالقرآن: اس کی مثال بیت المقدس ہے کہ اس کا قبلہ ہونا حدیث شریف سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو بدل کر کعبہ کو قبلہ بنادیا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ) (سورۃ البقرہ آیت ۱۴۴) (۱۲)۔

قرآن کریم میں نسخ کے اقسام: قرآن کریم میں نسخ کی تین قسمیں ہیں، تلاوت اور حکم دونوں کا نسخ مثلاً عشر رضعات معلومات۔

(۲) حکم کا نسخ تلاوت کا نہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول (كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَاۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ) (سورۃ البقرہ آیت ۱۸۰)

رفع حکم اور بقائے تلاوت کی حکمت: اس میں حکمت یہ ہے کہ جس طرح قرآن کی تلاوت اس لئے کی جاتی ہے کہ اس سے احکام کا علم ہو اور پھر اس پر عمل ہو اسی طرح اس کی تلاوت اس لئے بھی کی جاتی ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے، اس کے پڑھنے پر نیکی اور ثواب ملے گا تو تلاوت اس حکمت کے پیش نظر باقی رکھی گئی اور ایک حکمت اور بھی ہے، وہ یہ ہے کہ نسخ عموماً تخفیف کے لئے ہوتا ہے تو جب تلاوت باقی رکھی جائے گی تو رفع مشقت کی نعمت بار بار یاد آئے گی۔

۳- تلاوت کا نسخ حکم کا نہیں مثلاً الشيخ والشيخة اذا زنيا فارجموها نكالا من الله والله عزيز حكيم۔

رفع تلاوت اور بقائے حکم کی حکمت: اس میں حکمت یہ ہے کہ اس طریقے سے امت محمدیہ علی صاحبها الف الف تحیۃ کی کمال اطاعت شعاری کا اظہار منظور ہے اور دکھلانا ہے کہ اس امت

کے افراد کس طرح دلیل و تفصیل کے بغیر راہ خدا میں جان دینے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں اور یہ ایک ہلکا سا اشارہ پاتے ہی جان و مال کی قربانی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں جس طرح حضرت سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا علیہ الصلاۃ والسلام نے محض ایک خواب کی بنا پر اپنے نور نظر کو راہ خدا میں قربان کرنے کی مسارعت فرمائی حالاں کہ خواب وحی کا ادنی درجہ ہے۔(۱۳)

ذرائع علم نسخ: نسخ کا مدار نقل صریح پر ہوگا جو سرکار دو عالم ﷺ سے ثابت ہو اور اس نقل پر بھی ہوگا جو کسی صحابی سے ثابت ہو اس طور پر کہ فلاں آیت نے فلاں آیت کو منسوخ کیا ہے، خیال رہے کہ قرآن کریم میں ناسخ و منسوخ کی معرفت اس قدر دشوار نہیں کہ جس قدر حدیث شریف میں دشوار ہے حتی کہ امام زہریؒ کو کہنا پڑا ہے کہ اعیا الفقہاء و اعجزھم ان یعرفوا ناسخ حدیث رسول اللہ ﷺ من منسوخہ یعنی حدیث شریف میں ناسخ و منسوخ کی معرفت کے حوالے سے فقہا عاجز رہے(۱۴)۔

تاہم محدثین کرام نے اس کی معرفت کے چار طرق بیان کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

(الف) خود حدیث شریف میں اس کی صراحت ہو مثلاً یہ حدیث شریف جس کو امام مسلم نے حضرت بریدہؓ سے روایت کیا ہے کنت نھیتکم من زیارۃ القبور فزوروھا فانھا تذکرۃ الآخرۃ۔

(ب) کسی صحابی نے اس کی تصریح کی ہو مثلاً ابی بن کعبؓ کا قول ہے کہ کان الماء من الماء رخصۃ فی اول الاسلام ثم امر بالغسل (راوہ ابوداؤدؒ والترمذیؒ) اور جیسے حضرت جابرؓ کا یہ قول آخر الامرین عن رسول اللہ ﷺ ترک الوضوء مما مستہ النار (رواہ ابوداؤدؒ والنسائیؒ)۔

(ج) معرفت تاریخ: یعنی تاریخ سے معلوم ہو کہ کون سی حدیث مقدم ہے اور کون سی موخر تو پھر مقدم کو منسوخ اور موخر کو ناسخ قرار دیا جائے گا مثلاً شداد بن اوس کی حدیث ہے افطر الحاجم والمحجوم اس کو حضرت ابوداؤدؒ نے روایت کیا ہے، یہ ابن عباسؓ کی اس حدیث سے منسوخ ہے جس میں آیا ہے کہ ان النبی ﷺ احتجم وھو صائم اس حدیث کو امام مسلم نے اپنے صحیح میں روایت کیا ہے کیوں کہ حضرت ابن عباسؓ ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر

سرکار اقدس ﷺ کے ساتھ محرم تھے اور حضرت شداد بن اوس کی روایت ۸ھ میں اور فتح مکہ کے موقع کی ہے تو تاریخ سے اس کا انکشاف ہوا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت موخر اور حضرت شداد بن اوسؓ کی روایت مقدم ہے تو مقدم کو منسوخ اور موخر کو ناسخ قرار دے دیا گیا۔

(د) دلالت اجماع: خیال رہے اجماع ناسخ نہیں ہو سکتا ہاں نسخ پر دلالت کر سکتا ہے مثلاً یہ حدیث کہ من شرب الخمر فاجلدوہ فان عاد فی الرابعۃ فاقتلوہ (رواہ ابوداؤدؒ والترمذی عن معاویہؓ) اجماع اس حدیث کے نسخ پر دال ہے، اس کی تائید خود اس حدیث شریف میں ہو رہی ہے جس کو امام ترمذی نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ ان النبی ﷺ قال: ان شرب الخمر فاجلدوہ فان عاد فی الرابعۃ فاقتلوہ ثم اتی النبی ﷺ بعد ذالک برجل قد شرب الخمر فضربہ و لم یقتلہ یعنی نبی رحمت ﷺ نے فرمایا کہ اگر شراب پی لے تو کوڑے لگاؤ پھر اگر چوتھی بار پی لے تو اس کو قتل کر دو پھر حضور ﷺ کی خدمت میں ایک شخص کو لایا گیا جس نے چوتھی بار شراب پی لی تھی تو حضور ﷺ نے اس کو کوڑے لگائے اور قتل نہیں کیا، امام ترمذی فرماتے ہیں کہ قتل کا حکم اٹھالیا ہے اور رخصت دی گئی ہے(۱۵)۔

یہی چار طریقے جسے محدثینؒ نے ناسخ اور منسوخ کی معرفت کے بارے میں بیان کئے ہیں۔

لیکن اس ذیل میں یہ خیال رہے کہ متاخر الاسلام صحابی کی روایت اگر اس صحابی کی روایت کے متعارض ہو جو اس سے پہلے اسلام لایا ہو تو متاخر الاسلام صحابی کی روایت کو ناسخ نہیں قرار دیا جائے گا، اس کی وجہ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ کی زبانی سنیے، وہ فرماتے ہیں کہ ایسا ممکن ہے کہ اس متاخر الاسلام صحابی نے اس حدیث کو کسی ایسے صحابی سے سنا ہو جو اس مقدم الاسلام صحابی سے بھی پہلے اسلام لایا ہو یا اس متقدم الاسلام صحابی کے ساتھ اسلام لانے والے سے سن کر اسے مرسلاً روایت کر دیا ہو، جی ہاں اگر وہ متاخر الاسلام صحابی خود اس بات کی تصریح کر دے کہ اس نے اس حدیث شریف کو سرکار اقدس ﷺ سے براہ راست سنا ہے تو اس شرط کے ساتھ اسے ناسخ قرار دیا جائے گا کہ اس صحابی نے سرکار اقدس ﷺ سے قبل اسلام کچھ نہ سنا ہو(۱۶)۔

اس کی مثال میں اس حدیث شریف کو پیش کیا جا سکتا ہے جس کو حضرت جریرؓ سے امام ترمذیؒ نے روایت کیا ہے عن ھمام ابن الحارث قال بال جریر بن عبد اللہ ثم

توضا و مسح علی خفیه قیل له اتفعل هذا قال ما
یمنعنی وقد رأیت رسول اللہ ﷺ یفعله کان یعجبهم حدیث جریر لان
اسلامه کان بعد نزول المائدة۔

وعن ابن حوشب قال رأیت جریر بن عبد اللہ توضا و مسح علی
خفیه فقلت له فی ذالک فقال رأیت رسول اللہ ﷺ توضا و مسح علی
خفیه فقلت له قبل المائدة او بعد المائدة فقال ما اسلمت الا بعد
المائدة تو اس حدیث شریف میں صاف تصریح ہے کہ حضرت جریرؓ نے سرکار کو نزول مائدہ
کے بعد دونوں موزوں پر مسح کرتے ہوئے دیکھا۔

اخیر میں نسخ کے متعلق چند ضروری امور بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

۱- نسخ کا وقوع صرف اوامر و نواہی میں ہی ہوگا خواہ یہ اوامر و نواہی لفظ خبر ہی کے ساتھ
کیوں نہ ہوں اور وہ خبر جو طلب کے معنی میں ہیں اس کا نسخ نہیں ہوگا اور وعد و وعید بھی ثانی الذکر
کے قبیل سے ہے(۱۷)۔

۲- جو حکم کسی علت کی بنا پر ہوتا ہے وہ اس علت کے ختم ہو جانے کے بعد ختم ہو جاتا ہے،
علت کے زائل ہونے سے حکم کا رفع نسخ کے قبیل سے نہیں نساء کے قبیل سے ہوتا ہے اور نساء کا
مطلب یہ ہے کہ ہر وہ حکم جو وارد ہوا اور اس کی تعمیل کسی نہ کسی وقت تک اس علت کی بنا پر ضروری
ہو جو اسی حکم کو چاہتی ہے لیکن اگر علت کے ختم ہو جانے سے وہ حکم دوسرے حکم سے بدل جائے
مثلاً ضعف اور قلت کے وقت صبر اور معافی کا حکم تھا اور قوت و کثرت کے وقت قتال کے وجوب کا
حکم تو یہ نسخ نہیں از قبیل نساء کے ہے(۱۸)۔

۳- ناسخ کی کئی قسمیں ہیں، اول وہ فرض جس نے کسی فرض کو منسوخ کیا ہو مگر اس طرح کہ اول پر
عمل کرنا جائز نہیں مثلاً زانیوں کی حد سے ان کو قید کیے جانے کے حکم کا منسوخ ہونا، دوم کسی فرض نے کسی فرض کو
منسوخ کیا ہو مثلاً آیت مصابرت، سوم وہ فرض جس نے کسی مندوب کا حکم منسوخ کیا ہو مثلاً جہاد جو کہ اولاً
مستحب تھا بعد میں فرض ہو گیا، چہارم وہ امر مندوب جس نے کسی فرض کو منسوخ کیا ہو مثلاً قیام لیل یہ فَاقْرَءُوْا
مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ سے منسوخ ہے

تو یہ قرأت مستحب ہے اور وہ قیام فرض تھا(۱۹)۔

هذا ما ظهر لی و العلم الاتم عند ربی و صلی اللہ تعالی علیه وسلم علی
خیر خلقه سیدنا محمد و علی آله وصحبه و بارک و سلم۔

حواشی

(۱) الاتقان فی علوم القرآن (امام جلال الدین بن عبدالرحمان سیوطی شافعیؒ، متوفی ۹۱۱ھ، ج ۲، ص ۲۷، مطبوعہ ممبئی)۔(۲) تدریب الراوی (امام جلال الدین بن عبدالرحمان سیوطی شافعیؒ، متوفی ۹۱۱ھ، ج ۲، ص ۱۷۰، مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت لبنان)۔(۳) دیکھئے الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۲۷)۔(۴) التعریفات امام سید میر شریف جرجانیؒ، متوفی ۸۱۶ھ، ص ۲۱۵۔(۵) مدارک التنزیل امام عبداللہ ابن احمد بن محمود نسفیؒ، ج ۱، ص ۶۷، مطبوعہ ممبئی۔(۶) دیکھئے تفسیر کبیر امام فخرالدین رازیؒ، ج ۳، ص ۲۲۷، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ طہران، دیکھئے حاشیہ شیخ زادہ علی تفسیر القاضی البیضاوی، ج ۱، ص ۳۸۲، الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۲۷۔(۷) دیکھئے حاشیہ تفسیرات الاحمدیہ، شیخ احمد معروف بملا جیون جون پوری، ص ۱۵، مطبوعہ ممبئی۔(۸) دیکھئے التفسیرات الاحمدیہ، ص ۱۵۔(۹) الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۳۰، تفصیل اسی میں ملاحظہ کریں۔(۱۰) دیکھئے شرح صحیح مسلم مولانا غلام رسول سعیدی، ج ۲، ص ۷۰۔(۱۱) دیکھئے مصدر سابق، ج ۲، ص ۷۰۔(۱۲) ایضاً ص ۱۷۔(۱۳) الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۲۸، ۳۱، ۳۲ و التفسیرات الاحمدیہ، ص ۱۶۔(۱۴) کتاب علوم الحدیث امام حافظ ابن عمروؒ عثمان بن عبدالرحمانؒ، متوفی ۶۸۲ھ، ص ۱۱۹۔(۱۵) دیکھئے تدریب الراوی، ج ۲، ص ۱۷۱، ۱۷۲۔(۱۶) نزهة النظر امام حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، ص ۴۷۔(۱۷) الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۲۷۔(۱۸) ایضاً، ج ۲ ص ۲۸۔(۱۹) ایضاً۔

دیاناتھ وفاؔ اور مثنوی داغِ دل

از:- ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب ☆

فارسی اور اردو ادبیات میں مثنوی ایک مقبول صنف سخن رہی ہے، شمالی ہند میں مثنویات کے سرمائے کو خاک گم نامی سے برآمد کرنے اور اس کو متعارف کرانے کا کام ہر چند محققین ختم کر چکے ہیں (۱) اس کے باوصف معلوم نہیں کتنی تعداد میں مثنویات اب بھی موجود ہیں جنہیں کوئی نہیں جانتا، مثال میں دیاناتھ وفاؔ کی دو مثنویات ''گل وبلبل'' فارسی زبان میں اور ''داغِ دل'' اردو زبان میں، محققین کے علم میں نہیں آئیں اور وہ تعارف سے محروم رہ گئیں، ایسی صورت میں کہ یہ مثنویات دست یاب ہوگئی ہیں، ضروری معلوم ہوا کہ مثنوی داغ دل کو متعارف کرادیا جائے، تاکہ اردو مثنویات کے سرمائے میں اس کا بھی اضافہ ہوجائے، دیاناتھ وفا کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے، حالاں کہ وہ اپنے زمانے میں فارسی شاعر کی حیثیت سے معروف تھا، تعجب ہے کہ فارسی شعرا کے تذکروں میں بھی اس کا ترجمہ نہیں ملتا، صرف سید علی حسن خاں کے تذکرۂ صبح گلشن میں اس کا مختصر ترجمہ ملتا ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

''پنڈت دیاناتھ وفاؔ ولد مستارام از قوم کشارہ متوطن شہر بریلی بود و مشق سخن از میرزا علی اکبر عارف شیرازی می نمود'' ۔(۲)

تذکرہ نگار نے اس مختصر تعارف کے بعد فارسی کے پانچ اشعار بہ طور نمونہ کلام درج کئے ہیں:

ڈاکٹر نریندر بہادر سری واستو نے اپنی تالیف ''نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگ دان'' میں برج کشور کول کے تذکرۂ بہار کشمیر کے حوالے سے دیاناتھ وفاؔ کے متعلق تحریر کیا:

''اصلی نام پنڈت دیاناتھ سپرو اور تخلص وفاؔ ہے، اگرچہ آپ خوش گو اور

☆ ۷۳ پھول والان، بریلی، ۲۴۳۰۰۳۔

قادر الکلام شاعر تھے مگر مقام حیرت ہے کہ آپ کے حالات زندگی مفقود ہیں جب کہ آپ کا کلام ملتا ہے'' ۔(۳)

اس کے بعد سری واستو نے چھ اشعار فارسی بہ طور نمونہ کلام نقل کئے ہیں۔

دیاناتھ وفا سید علی حسن خاں کی اطلاع کے مطابق میرزا علی اکبر عارف شیرازی کا لکھنؤ میں شاگرد ہوا تھا، عارف شیرازی سید علی حسن خاں کے بہ قول میرزا ابوالحسن شیرازی کا فرزند تھا اور بہ زمانہ نصیر الدین حیدر بادشاہ صوبۂ اودھ (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۳ء) لکھنؤ وارد ہوا اور عسرت و تکلیف میں زندگی گزاری بعد کو محمد علی شاہ بادشاہ صوبۂ اودھ (۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء) نے اس کا وظیفہ مقرر کردیا (۴)، اس اطلاع سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دیاناتھ وفا نصیر الدین حیدر کے عہد حکومت (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۳ء) میں لکھنؤ میں مقیم ہوچکا تھا۔

مزید برآں دیاناتھ وفا کے حالات اس کی فارسی مثنوی گل وبلبل میں بھی مل جاتے ہیں، دیاناتھ وفاؔ نے ۱۳؍فروری ۱۸۴۷ء کو یہ مثنوی نواب واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر دو قطعاتِ تہنیت اور ایک مدحیہ قصیدے کے ساتھ نواب موصوف کو بہ امید قدردانی و حوصلہ جوہر شناسی پیش کی تھی، دیاناتھ وفا نے مثنوی گل وبلبل کے آغاز میں تحریر کیا:

''......منکہ پنڈت دیاناتھ وفا کشمیر البریلی ام، بعد جہاں گردی و بادیہ پیمائی گرم وسرد زمانہ دیدہ، مرارت وعذوبتِ ہر امصار و دیار چشیدہ، از مدت دریں شہر غیور رسیدہ بود، اگرچہ نہ مونس وغم خوار داشتم کہ دیگ تحبتش بامن دل ناشاد بہ جوشید، ونہ مہربان ودلدار بودہ است کہ بہ توقیر وعزتم می گوشید، بالفعل بہ سپاس جلوس شاہ والا گہر سلطان ہفت کشور ایں خطہ دل پذیر مامنِ اہل ہنر وملجائے ارباب فنون شدہ......خواستم کہ نقدم کم عیار نتیجۂ خود در سلک نظم منسلک کردہ، نثار فرق مبارک سازم......تا بانعام قدردانی وجوہر شناسی محروم نمانم واز متمتعات دنیا بے بہرہ ونامراد نباشم'' ۔(۵)

اس تحریر سے معلوم ہوا کہ دیاناتھ وفا کشمیری الاصل اور متوطن بریلی تھا، اس نے بریلی کے باہر قدم نکالا اور جہاں گردی کی اور مختلف شہروں کے تلخ وشیریں حالات کا ذائقہ چکھا، آخر

میں لکھنؤ پہنچا جہاں اس نے ایک غریب الدیار کی طرح دن گزارے، لکھنؤ میں نہ کوئی اس کا دوست تھا اور نا ہی غم خوار اور نہ کوئی اس کی توقیر وعزت کرنے والا، جب اہل ہنر اور ارباب فنون کے مامن وملجا شہر لکھنؤ میں نواب واجد علی شاہ کی تخت نشینی کا وقت آیا، اس نے دو قطعاتِ تہنیت اور ایک قصیدہ نواب کی خدمت میں پیش کیا، تاکہ وہ قدردانی وصلہ جوہر شناسی اور متمتعاتِ دنیا سے بے بہرہ ونامراد نہ رہے۔

دیاناتھ وفا نے نواب واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر مثنوی گل وبلبل کو قطعاتِ تہنیت اور مدحیہ قصیدے کے ساتھ اس خیال سے منسلک کردیا کہ اس کا اعتبار قائم ہو اور اس کی تہنیت وقصیدہ بغیر کسی اشتباہ کے قبول ہوجائیں، اس نے مثنوی گل وبلبل کی تمہید میں تحریر کیا:

"بعدہ فکر رسا مہتدی دریں باب گردید کہ داستان غریب وقصہ عجیب یعنی حال تعشق بلبل با گل کہ بہ وقت از اوقات خوش خامہ طبع ریختہ بود و بہ نام گل وبلبل نامزد شدہ، آں را در ذیل ایں ابیاض در آوردہ بہ موقف باریابان درگاہ اشتباہ باشد گزرانید کہ بہ محک اعتبار در آمدہ در روزگار یادگار بماند، من اللہ التوفیق وھو ہذا"۔(۶)

اب مندرجہ بالا معلومات سے دیاناتھ وفا کی حیات کے متعلق یہ امور اخذ کیے جاسکتے ہیں:

نام دیاناتھ ولد مستارام، پنڈت کشمیری الاصل، سپرو، متوطن بریلی، بریلی کے باہر قدم نکالا، مختلف دیار وامصار میں گھومتا رہا، آخر میں لکھنؤ پہنچا جہاں غربت وعسرت کی زندگی بسر کی، نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۳ء) کے عہدِ حکومت میں میرزا علی اکبر شیرازی کا شاگرد ہوا، فارسی گو تھا اور فارسی شاعر کی حیثیت سے معروف ہوا، دیوان غزلیات دست یاب نہیں، دو مثنویات تحریر کی تھیں، پہلی مثنوی اردو زبان میں ہے، اس کا نام داغ دل ہے، یہ تاریخی نام ہے (۱۲۳۹ھ/ ۲۴-۱۸۲۳ء) یہ زمانہ نواب غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء) کا تھا، دوسری مثنوی فارسی زبان میں ہے، اس کا نام گل وبلبل ہے جس کا مسودہ اس کی بیاض میں محفوظ تھا اور جو اس نے نواب واجد علی شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر (۱۳؍فروری ۱۸۴۷ء) دو قطعاتِ تہنیت اور ایک قصیدے کے ساتھ منسلک کرکے برائے قدردانی وصلہ جوہر شناسی نذر کیا، نواب

واجد علی شاہ (م ۱۸۸۷ء) کی جانب سے اس کو انعام ملا یا نہیں، اس بات کا علم نہیں، مذکورہ بالا دونوں مثنویات گم نام تھیں جن کا علم کافی تاخیر سے ہوا، رام پور رضا لائبریری رام پور میں دونوں مثنویات پر مشتمل ایک مطبوعہ نسخہ موجود ہے (نظم فارسی-۲۹۸) جس کی طباعت بہ عنوان "دو مثنوی غم زاد"، مطبع محمدی (۷) میں باہتمام حاجی حرمین محمد حسین ہوئی تھی، مقامِ مطبع اور تاریخِ طباعت ندارد ہے، تمت کے نیچے مستطیل خالی ہے، حوض میں فارسی مثنوی گل وبلبل اور حاشیے میں اردو مثنوی داغ دل کو طبع کیا گیا ہے، تعداد صفحات ۲۵ ہے، فارسی مثنوی گل وبلبل میں اشعار تہنیت اور قصیدے کے علاوہ ۱۰۱۳ اور مثنوی داغ دل میں ۱۳۸۳ اشعار ہیں، نسخہ کرم خوردہ ہے، عکسی نقل بھی صاف نہیں ہے، املا قدیم ہے، تاہم عبارت اور اشعار کو نقل کرتے وقت ان مشکلات کو رفع کردیا ہے، معلوم نہیں دیاناتھ وفا کی وفات کب اور کہاں ہوئی۔

دیاناتھ وفا نے اردو مثنوی داغ دل کے آغاز میں تحریر کیا:

"شکر وسپاس اوس کریم کارساز حقیقی کا ہے کہ جس کی قضائے ممضی نے واسطے ہدایت ظلوم وجہول کے ذات پاک کو رسول مقبول کی قوت بطون سے فعل ظہور میں لاکر علی ابن طالبؑ کو امام انام اور وصی نبی کا کیا اور مخلوق پریشاں حال کو ایک ہزار دو سو تریسٹھ ہجری میں بادشاہ جم جاہ کیواں سریر سلطان ابن السلطان مرزا واجد علی شاہ خلف امجد علی شاہ غفران پناہ کی حمایت میں نگاہ رکھا ہے.....یعنی وہ بادشاہ ہے کہ فریدوں اگر ہوتا اس کے لشکر کی عمل داری کو فخر اپنا جانتا اور اسکندر بھی اس کے آستانے کی خاک کو تاج اپنے سر کا سمجھتا......"۔(۸)

اس مبالغہ آمیز تعریف کے بعد دیاناتھ وفا نے تیرہ اشعار کا قصیدہ لکھا جو مرزا محمد رفیع سودا (م ۱۷۸۱ء) کی زمینِ قصیدہ میں ہے۔(۹)

نبی ہے کشتیٔ سائل نظیر کشتی نوح
ہوئی یہ فیض سے آب گہر کی طغیانی
نگاہ مہر جو گلخن پہ لطف فرما ہو
شرارے آگ کے بن جائیں لعل رمانی

ضعیف سب ہیں قوی شاہ کی حمایت سے
ہر ایک مور کو ہے دعویٰ سلیمانی
اُڑا ہے جب درِ دولت کی خاک کا ذرّہ
جبین مہر منور ہوئی ہے نورانی
زباں ہر سر مو تن پہ ہو اگر گویا
ادا نہ ہوگا وفاؔ شمۂ ثناخوانی

اس کے بعد دیاناتھ وفاؔ نے مثنوی داغ دل کی تالیف کے سلسلے میں لکھا:

"......دیاناتھ وفا بریلی کے رہنے والے کشمیری نے...... ارادہ کیا کہ مثنوی داغ دل...... کہ زبان اردو میں فسانہ عجیب لطیف و دلکشا ہے، با امید داد رسی اور قدردانی کے پیش گاہ و نظر بندگان کیواں میں گزرانی تاکہ مدت تک نام باقی اور حکایت یادگار رہے"۔ (۱۰)

اس عبارت کے فوراً بعد مثنوی داغ دل شروع ہوتی ہے، اس بات کو باور کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے کہ دیاناتھ وفاؔ نے فارسی و اردو کی مثنویات کا مطالعہ کیا تھا اور ان کے اثرات قبول کیے تھے، داغ دل ایک المیہ مثنوی ہے، اس کی کہانی درد کی اہمیت اور عشق پر اظہار خیال اور المناک انجام سے واقف ہونے کے بعد یہ گمان ہوتا ہے کہ وفاؔ نے میر تقی میرؔ (م ۱۸۱۰ء) کی مثنویات دریائے عشق اور اعجاز عشق کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔

مثنوی داغ دل کا موضوع عشق ہے، درد و الم سے بھرا عشق جس میں جاں سپاری شرط وفا ہے، مثنوی نگار نے تمہید میں ہی تحریر کیا ہے:

درد سے چشم تر کر اے خامہ — درد دل سے سیاہ کر نامہ
درد سے آب و تاب پائے سخن — درد سے نعرہ زن ہے مرغ چمن
ثمرۂ نخل غم کشاں ہے درد — مطلب خاص انس و جاں ہے درد
عشق ہے گر شراب درد گزک — عشق ہے گر کباب درد نمک
درد جس دل میں اپنا گھر کر جائے — اس کو غیر درد پھر نہ خوش آئے

درد سے جس کا دل نہیں ہے گداز — باب عرفان نہ ہوگا اس پہ باز
درد سے مجھ کو بھی محبت ہے — درد سے دل کو میرے الفت ہے
عشق کا کچھ بیان لکھتا ہوں — درد کی داستان لکھتا ہوں
ہوگیا ہوں زبس تمام وفاؔ — شہرۂ عام ہوں بنام وفاؔ
خون دل سے بنا کے اب شنجرف — جذبۂ عشق میں لکھے یہ حرف (۱۱)

درد کی یہ کہانی اس طور پر ہے:

قنوج میں ایک آہن گر تھا، اس کا فرزند بہت حسین تھا، اس کا نام جمال تھا، جمال کو سیر گلزار کی عادت تھی، ایک دن اس کو گلزار کی سیر کے دوران ایک ماہ رو نظر آئی جس کے تیر عشق کا شکار ہوکر زمین پر گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا، جب کافی دیر کے بعد اس کو ہوش آیا، ماہ رو کو پاس نہ پاکر بے قرار ہوگیا، مضطرب و بدحال گھر واپس گیا اور ہوش و حواس کھوکر خانہ نشین ہوگیا، جب جمال ایک دو ہفتے بے خور و خواب رہا تو خویش و اقربا مضطرب ہوئے اور اس کی صحت یابی کی تدابیر میں لگ گئے لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی اور اس کا جنون بڑھ گیا، ایک دن جمال کے باپ نے یہ خیال کرکے کہ اس کے بیٹے کو خلل عشق ہوسکتا ہے، جمال سے دریافت کیا کہ وہ کس شمع کا پروانہ ہے جس کی وجہ سے وہ اس حال کو پہنچا، جمال کا دل اپنے باپ کی پریشانی کو دیکھ کر پسیج گیا، اس نے بتایا کہ محلے میں باغبان کی دختر رہتی ہے جس کو وہ دیکھتا رہتا تھا لیکن اس دن اس کو دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھا، جمال کا باپ یہ روداد سن کر باغبان کے پاس گیا اور رو رو کر اپنے بیٹے کا حال بیان کیا اور اس سے کہا کہ اگر وہ اپنی دختر کو ساتھ کردے تو شاید اس کی رفاقت میں اس کے لڑکے کا جنون رفع ہوجائے کیوں کہ دونوں ہم محلہ اور بے تکلف ہیں، یہ سن کر باغبان نے ازرہِ ہمدردی اپنی بیٹی کو آہن گر کے ساتھ کردیا، آہن گر نے باغبان کی دختر کو جمال کے پاس بٹھا دیا، جمال نے باغبان کی دختر کو اپنی پردرد کہانی سنائی جس کو سن کر وہ مضطرب ہوگئی، رونے لگی اور عشق نے اس کے دل میں بھی گھر کرلیا، وہ معشوق سے عاشق اور مطلوب سے طالب ہوگئی، وہ بادیدۂ تر گھر واپس گئی اور گوشہ نشین ہوگئی، وہ دوسری بار جمال کے گھر گئی اور آخرکار دونوں کے عشق کا چرچا ہونے لگا، باغبان کو رسوائی کا خوف ہوا اور اس نے اپنی بیٹی کو گھر میں قید کردیا، جمال اور

باغبان کی بیٹی کے درمیان ترک ملاقات سے دونوں درد والم کا شکار ہوئے، جمال کو تپ لرزاں اور یرقان کے امراض ہوگئے، باغبان کی دختر پر وحشت کا زور ہوا اور وہ سودائی ہوگئی، باغبان بدنامی کے ڈر سے اپنی دختر کو شب کی تاریکی میں محافے میں بٹھا کر وہاں لے گیا جہاں اس کی نسبت ہو چکی تھی لیکن یہ تدبیر کام نہیں آئی، جمال نے جان دے دی، جب باغبان کی دختر کو جمال کی موت کا علم ہوا، زندگی سے بیزار ہوگئی، خاک پر ایسی بیٹھی کہ پھر اٹھ نہیں سکی، عشق نے کام تمام کیا اور مثنوی انجام کو پہنچی۔

اس کہانی کے ضمن میں چند باتیں غور طلب ہیں:

۱- کہانی کا تعلق ایک قدیم تاریخی شہر قنوج سے ہے۔

۲- کہانی کے کردار نچلے طبقے کے محنت کش آہن گر، باغبان اور ان کے فرزند و دختر ہیں۔

۳- کہانی میں پریوں جنوں دیووں جادوگروں درویشوں اور عاملوں کا دخل نہیں ہے۔

۴- کہانی سفلی جنس زدگی اور عیش وطرب کی فضا سے عاری ہے۔

۵- کہانی میں المناک انجام کا باعث پاسِ عزت وناموس اور خوف رسوائی ہے۔

یہ امور عشقیہ مثنویات کے مروجہ میلانات سے انحراف کا ثبوت پیش کرتے ہیں، اس مثنوی میں کسی دور دراز یا تخیلاتی شہر نیوسواد کا ذکر نہیں ہے، ہیرو اور ہیروئن شاہزادہ اور شاہزادی نہیں ہیں، پریوں جنوں جادوگروں درویشوں اور عاملوں کا اثر ونفوذ نہیں ہے، جنسی لذت، عیش و طرب اور سطحی جذباتیت سے خالی ہے، انجام غیر فطری نہیں ہے، عاشق ومعشوق کی روحیں آپس میں مل کر عالم بالا کی طرف پرواز نہیں کرتی ہیں، ایک سادہ سی عامۃ الورود مثنوی ہے جس پر واقعاتی صداقت کا گمان ہوتا ہے، قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دیاناتھ وفا نے یہ مثنوی اپنی جہاں گردی کے زمانے میں قنوج میں تالیف کی اور بعد کو لکھنؤ ساتھ لے آئے۔

مثنوی میں صرف چار کردار ہیں، آہن گر، باغبان، آہن گر کا بیٹا جمال اور باغبان کی بیٹی، مثنوی نگار نے جمال کے علاوہ کسی کا نام نہیں لکھا، صحیح معنی میں یہ چاروں کردار نہیں ہیں، نمونے یا پہچان ہیں، مثنوی عشق کے محور پر گھومتی ہے، آہن گر کا بیٹا اور باغبان کی بیٹی عشق کے بندے ہیں، جمال کا باپ اپنی اولاد سے محبت کرنے والا بزرگ ہے، ہیروئن کا باپ ناموس کی خاطر اپنی

بیٹی کی موت کا سبب بن جاتا ہے، اس کی پہچان سے مثنوی کا اخلاقی پہلو نمایاں ہوتا ہے، اس عہد کے قاری کے ذہن میں یہ بات ضرور ابھر سکتی ہے کہ سفلی عشق کے مقابلے میں عشق صادق کا انجام موت پر ہوتا ہے۔

مثنوی نگار نے مثنوی داغ دل میں طوالت کے بجائے اختصار پر انحصار کیا، واقعاتی صداقت کو نظر میں رکھا اور روایتی آرائشوں سے گریز کیا، مثنوی میں غزل کے پیوند نہیں لگائے، تقریبات کی دھوم دھام، رسول کے بیانات اور خوشی کے موقع پر چہل پہل کے مرقعے بھی نہیں ہیں، ایک المیہ مثنوی میں ان کی گنجائش بھی نہیں تھی، مثنوی کا تعلق محنت کش طبقے سے ہے، جاگیردارانہ نظام میں محنت کش طبقے کے نصیب میں امیروں کی محفلوں جیسی دھوم دھام کہاں، رسوم ورواج، تقریبات، ناچ رنگ، سجاوٹ، پوشش وطعام وغیرہ جو امیروں کی محفلوں سے مخصوص تھے، ان کی دھوم دھام سے غریب طبقہ خوش ضرور ہوتا لیکن یہ خوشیاں ان کے مقدر میں نہیں تھیں، مثنوی نگار نے غریب طبقے کے عمل، ردعمل، سوچ اور میلانات کا ہی اظہار کیا ہے، مثال میں باغبان کی لڑکی کے عشق کا حال تیمارداروں کو معلوم نہیں تھا، وہ اپنے اپنے طور پر اس کے علاج کی تدبیریں کرنے لگے، جیسے:

کوئی حکمت کی رو سے کچھ لایا — کوئی افسوں گروں کو لے آیا
تھا جلاتا کوئی فتیلے کو — کوئی کچھ کچھ کہے تھا، مضطر ہو
ہے مگر سایۂ پری اس پر — ہے لگی بد نظر کی اس کو نظر
یا کسی نے کیا ہے یہ جادو — ہے تفاوت نہ اس میں اب سرمو (۱۲)

لیکن مجموعی طور پر مثنوی سے ایک آہن گر اور ایک باغبان کی طرز معاشرت، ان کے احساسات، رجحانات، میلانات اور ہم عصر نظام حیات سے تعلق کا اندازہ نہیں ہوتا، ان کا رہن سہن، ان کی روزمرہ کی زندگی، ان کی رسوم وتقریبات اور ان کی سادہ زندگی میں ان کی خوشیوں کے مواقع اور معیار کا اندازہ نہیں ہوتا، مثنوی نگار کی نظر میں یہ محض ایک عشقیہ مثنوی تھی، اس نے عشق کی حدود کے باہر قدم نہیں نکالا، مثنوی نگار نے شاید یہ بات باور کرانے کی کوشش کی کہ عشق صادق نچلے طبقے میں ہی ممکن تھا، اعلا طبقے میں عشق کا مطلب ہوسناکی اور عیش طلبی سے عبارت

تھا، اس عہد کے عیش ونشاط کے ماحول میں یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ایک عشقیہ مثنوی میں جذبات نگاری کے مواقع، کہانی کے ہر موڑ پر ملتے ہیں، تیر عشق سے گھائل ہونے کا درد اور اس کا اثر مابعد، اعزا و احباب کی پریشانی، درد جدائی اور موت یہ سب ہی اعلا جذبات نگاری کے مواقع ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ جذبات فطری ہوں اور ان کو فطری زبان میں ہی پیش کیا جائے، مقتضائے حال کے مطابق ہی کسی حالت یا کیفیت کو اس طرح قلم بند کیا جائے کہ وہ فطری معلوم ہوں، مثلاً باغبان کی دختر جمال کی زبوں حالت دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر اتنی متاثر ہوئی کہ اس پر عشق کا غلبہ ہوگیا ؎

تھی وہ مطلوب ہوگئی طالب　　گرمیٔ عشق ہوگئی غالب

اور جب وہ جمال کے پاس سے اٹھ کر اپنے گھر واپس آئی، مثنوی نگار نے اس کی حالت کا جو نقشہ پیش کیا، وہ متقاضائے حال ہونے کی وجہ سے فطری تھا ؎

اس کے دل پر جو زور عشق ہوا　　بیٹھی گوشے میں ہوکے وہ تنہا
دیدۂ تر سے خوں بہانے لگی　　غم دل - دل ہی کو سنانے لگی
غیر گریہ نہ اس کو پیارا تھا　　شغل نالہ ہی بس گوارا تھا
آیا نزدیک اس کے بس کوئی　　دردِ سر کا فریب کر روئی
الغرض وہ پہاڑ سے شب و روز　　کاٹے جوں توں بآہ و نالۂ سوز
صبح کے بعد انتظار تمام　　کہ تھی ماتم زدوں کے ہجر کی شام (۱۳)

دوسرے دن جب وہ جمال کے گھر جاتی ہے تو وفور عشق میں آنکھیں نم ہوجاتی ہیں اور زبان بند ہوجاتی ہے، مثنوی نگار نے یہ واقعاتی منظر اس طرح پیش کیا ہے ؎

دل ہی دل میں وہ دونوں دل مل کر　　چشم پُرآب ہوگئے یکسر
تار تار نظر میں مژگاں سے　　گوہر اشک کو پرونے لگے
کہ اشاروں سے درد دل کہتی　　گاہ در پر وہ دل میں غم سہتی
اس کے رونے کی اس نے کی تسکیں　　اس کے اندوہ سے ہوا غمگیں (۱۴)

مثنوی نگار نے جمال کے مرض الموت کا ذکر کرتے ہوئے واقعاتی رویہ اختیار کیا یعنی

اس کی موت تپ لرزاں، بحران، یرقان اور فسادِ جگر سے ہوئی، جگر سے خون جاری ہوا اور وہ فوت ہوگیا، باغبان کی دختر کو جب جمال کی موت کی خبر کا علم ہوا، اس کو اپنے عاشق کے حسرت زدہ اور محروم تمنا جانے کا شدید احساس ہوا، مثنوی نگار نے اس کیفیت کے اظہار میں اختصار سے کام لیا لیکن اس اختصار میں جہان کرب والم کی وسعت اور کیفیت پوشیدہ ہے، باغبان کی دختر نے جان دے دی، مثنوی نگار نے اس کے اضطراب اور موت کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے:

ہوگیا دل مرا زبوں ہے ہے　　چھوڑ جائے وہ مجکو یوں ہے ہے
ہے نہ یہ شرط الفت و یاری　　ہے نہ یہ راہ و رسم دل داری
کیا کروں اب میں ساری زیبائی　　خاک میں اب ملی یہ رعنائی
میں جیوں آہ کس تمنا پر　　ایسے جینے سے موت ہی بہتر
ہو دل زار و دیدۂ غم ناک　　ہوگئی لوٹ پوٹ برسر خاک
ہوئی دل کو طپیدگی حاصل　　ہوئی جان کو کشیدگی حاصل
بے قراری سے خاک پر بیٹھی　　ہاتھ سے تھام کر جگر بیٹھی
ایسی بیٹھی نہ پھر وہاں سے اٹھی　　لاش اس کی مگر جہاں سے اٹھی
عشق نے اپنا کام ختم کیا　　تب وفا نے کلام ختم کیا (۱۵)

پوری مثنوی میں صادق جذبات کی حرارت ہے، عام فہم بامحاورہ زبان اس پر مستزاد، یہ مثنوی مختصر سہی، اس میں جامعیت کی نمود ہے۔

مثنوی نگار نے دونوں مثنویات میں محبوب کے سراپا کا اہتمام کیا ہے، فارسی مثنوی گل و بلبل میں محبوب کا سراپا زیادہ مفصل، بے محابا اور پرشوکت زبان میں ہے، اردو مثنوی داغ دل میں محبوب کا سراپا مجمل اور محتاط ہے، مثنوی نگار نے صنائع کے ذریعہ محبوب کے پیکر کی مصوری کی لیکن نظر کو بھٹکنے نہیں دیا، مثال میں یہ چند اشعار ؎

رخ تاباں کے گرد زلف سیاہ　　خوش نما جس نمط ہو ہالۂ ماہ
بسکہ تھا مثل غنچہ تنگ دہاں　　رشک سے اس کے غنچہ لال وہاں
مسی مالیدہ لب میں سلک گہر　　دامن شب میں جوں نمود سحر

پنجۂ دست - پنجۂ مرجاں   ہر رگ جاں سے کھینچتا تھا جاں
کبھی رکھے جو برگ گل سر پر   بار سے ہوئے در خیال کمر
برسر انگشت پاؤں کی فندق   جلوہ گر تھی جہاں میں مثل شفق[16]

اس سراپا میں انیس اشعار ہیں جن میں باغبان کی دختر کے اعضائے جسمانی کی تصویر کھینچی گئی ہے، اس کے علاوہ مثنوی نگار نے جمال کا سراپا بھی درج کیا ہے لیکن وہ مختصر اور زیادہ مبالغہ آمیز نہیں ہے، ایک چہاردہ سالہ جوان کے حسب حال ہے۔

ماہ وش سر و قد جوان حسیں   سورۂ نور تھی بیاض جبیں
شاہ بیت قصیدہ خوبی   مطلع حسن و ناز و محبوبی
چال میں بات - بات میں انداز   آفت جان و دل - سراپا ناز
چودہویں سال میں وہ خوش منظر   ماہ دو ہفتہ سے بھی روشن تر
بس کہ رکھتا تھا وہ کمال جمال   کہتے تھے سب اوسے جمال جمال[17]

بہ ظاہر وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ مثنوی نگار کو فارسی میں جملہ اعضائے محبوب کی سراپا نگاری میں کوئی باک نہیں تھا لیکن اس نے ایک اردو المیہ مثنوی میں شوخی قلم سے گریز کیا۔

ایسی صورت میں جب کہ پنڈت دیاناتھ وفا کی مثنویات پردۂ گم نامی سے برآمد ہوگئی ہیں، ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، مثنوی داغ دل صف اول کی مثنوی نہ سہی اس کا شمار عشقیہ مثنویات کے زمرہ میں کیا جاسکتا ہے اور شعرائے لکھنؤ کی مثنویات کے سرمائے میں اس کا اضافہ ہوسکتا ہے۔

حواشی اور حوالہ جات

(۱) رک اردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں) ۱۷۵۰ء سے ۱۹۵۰ء تک، از ڈاکٹر محمد عقیل، ۱۹۶۵ء۔ (۲) صفحہ ۵۹۴۔ (۳) صفحہ ۱۵۵۔ (۴) صفحہ ۲۶۹۔ (۵) صفحہ ۳۔ (۶) صفحہ ۶۔ (۷) اختر شہنشاہی حصہ اول میں محمدی کے نام سے چھ مطابع کا ذکر ملتا ہے لیکن ان میں کوئی ایسا مطبع نہیں ہے جس کے مہتمم حاجی حرمین محمد حسین تھے۔ (۸) صفحہ ۲۔ (۹) مطلع پڑھنے میں نہیں آیا، ورق ۲ کی تراش میں نصف رہ گیا، یہ اصلاً خاقانی (م ۱۱۸۶ء) کے

قصیدے کہ ہمت راز تا شویست باز انو وپشیانی، کی زمین میں ہے، اسی زمین میں سودا (م ۱۷۸۱ء) کا قصیدہ نعت ہے۔ ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی   نہ ٹوٹے شیخ سے تسبیح زنار سلیمانی

(۱۰) صفحہ ۳۔ (۱۱) صفحہ ۴-۵۔ (۱۲) صفحہ ۹۔ (۱۳) صفحہ ۱۹۔ (۱۴) صفحہ ۲۰۔ (۱۵) صفحہ ۲۵۔ (۱۶) صفحہ ۷۔ (۱۷) صفحہ ۵۔

کتابیات

علی حسن خاں، سید، تذکرۂ صبح گلشن (فارسی)، مطبع شاہ جہانی بھوپال، ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء۔

محمد اشرف نقوی، اختر الدولہ، حاجی، سید، اختر شہنشاہی، اختری پریس لکھنؤ، ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء۔

محمد عقیل، ڈاکٹر، اردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں) ۱۷۵۰ سے ۱۹۵۰ تک، مطبع اسرار کریمی الہ آباد، ۱۹۶۵ء۔

نریندر بہادر سری واستو، ڈاکٹر، نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگ دان، ناظم پریس رام پور، ۱۹۷۹ء۔

تیموری شہزادیوں کا علمی وشعری ذوق

از:- جناب مولوی محمد احمد بیگ بہرائچی ☆

ہندوستان کی تاریخ میں تیموریوں کا دور حکومت اپنی گونا گوں خصوصیات و بوقلموں کارناموں کی وجہ سے ایک نمایاں اور ممتاز مقام کا حامل ہے، تیموری سلاطین نے جہاں ملک کے دائرے کو بڑھایا وہاں تہذیب وتمدن اور علوم ومعارف پروری کی حیثیت سے ہندوستان کی عظمت کا تاج محل بھی تعمیر کیا، انہوں نے کشور کشائی کے ساتھ اس سرزمین کو تہذیب وثقافت کی باد بہاری سے مشکبار بھی کیا اور چمنستان ہند کو علم وادب اور فکر وفن کے خوش رنگ پھولوں سے معمور کردیا۔

علم وادب کے گیسوؤں کو تابدار بنانے میں ایشیائی حکومتوں میں شاید ہی کسی حکومت کی تاریخ تابناک وحسین ہو جتنی تیموری سلاطین کی ہے، ان کو یہ ذوق علم وادب اپنے مورث اعلا امیر تیمور صاحب قران سے وراثت میں ملا تھا کیوں کہ خود امیر تیمور تیغ وقلم دونوں کا دھنی تھا، اس کی زندہ مثال اس کی تزک ہے جو تزک تیموری کے نام سے دنیائے علم وادب میں معروف و مشہور ہے، چنانچہ ہندوستان کے تیموری سلاطین میں سے دو ایک کو چھوڑ کر سبھی علم وادب کے زیور سے آراستہ تھے، شہزادوں اور شہزادیوں کی تعلیم وتربیت کی جانب پوری توجہ کی جاتی تھی، ان کو علوم متداولہ کی تعلیم دی جاتی تھی، اس باب میں شہزادوں کے دوش بہ دوش شہزادیوں کا اپنا ایک جداگانہ رنگ ہے، ان کا علمی، ادبی، شعری ذوق ہندوستان کی ثقافتی، علمی وادبی تاریخ کا ایک زریں وانمول وگراں مایہ حصہ ہے، اس طرح کی تاریخ سے تیموری شہزادیوں کے ثقافتی مذاق کا

☆ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ۔

اندازہ ہوتا ہے، نیز اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اس دور میں علم وادب کا سماجی ومعاشرتی زندگی میں کتنا عمل دخل تھا، تذکرے وتاریخ کی کتابوں میں صدہا ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تیموری شہزادیاں علم وادب وشعر کا کتنا صاف ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتی تھیں۔

بابر ۱۵۳۰ء کے عہد سے آخری مغل تاج دار سراج الدین بہادر شاہ ظفر ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ جو سوا تین سو سال کے طویل عرصے پر محیط ہے، اس لمبے عہد میں سینکڑوں مغل شہزادیاں پردۂ عدم سے لباس وجود پہن کر آئیں اور وہ قصر شاہی وحریم ناز کی زینت بن کر ہی نہیں رہیں بلکہ علم وادب اور فکر وفن کی تنویر افشانی بھی کی اور اس میدان میں ایسا کمال بہم پہنچایا کہ ان کا کاروان علم وادب لیل ونہار کے دھاروں کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور تاریخ کے نہ مٹنے والے براعظم میں ہمیشہ ہمیش کے لئے ٹھہر گیا، تاکہ بعد میں آنے والی نسلیں جان سکیں کہ تیموری شہزادیوں نے علم وادب کے لالہ کی حنابندی کس طرح کی تھی اور کس طرح اپنے طائر شوق کو ریاض علم وادب میں چہکنے کا موقع دیا۔

تیموری شاہزادیوں کی علمی بزم میں جس کے علم وادب کی نمود سب سے پہلے ہماری آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے وہ بابر کی بیٹی گلبدن ہے، اس کی ماں کا نام دلدار بیگم تھا جس کا اصلی نام صالحہ سلطان تھا، یہ بابر کی پانچویں بیوی تھی، بابر کی اس بیوی سے تین لڑکیاں اور دو لڑکے پیدا ہوئے، دلدار بیگم سلطان محمود مرزا فرماں روائے سمرقند کی بیٹی تھی، گلبدن کی ولادت ۱۵۲۳ء میں شہر کابل میں ہوئی، جب اس کے والد کا انتقال ۱۵۳۰ھ میں ہوا تو اس کی عمر ۸ سال تھی، تاہم اپنے باپ کی حیات میں اور اس کے بعد بھی خرمن علم وادب سے خوشہ چینی میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور کیوں نہ وہ علم وعرفان کی شاخ نہال سے لطف اندوز ہوتی، اس کی زلفوں سے کھیلتی اور چمنستان ادب میں نسیم سحری سے ہم آغوش ہوکر ادب وشاعری کے مسکراتے ہوئے، مہکتے ہوئے پھولوں سے اپنی زندگی کو سجاتی، کیوں کہ جس گھوارے میں اس نے تربیت پائی وہ سراپا علم وادب تھا، وہاں ہر ہر بچہ علم وادب کا پرستار وشیدائی تھا، ہر گھڑی شعر وشاعری کی باد نسیم چلا کرتی تھی، سخن فہمی وسخن سنجی کی سرمست ہواؤں سے آہوان ناز کے دلوں کی کلیاں مسکراتی تھیں، خود گلبدن بیگم کا باپ شہنشاہ بابر، فارسی وترکی کا باکمال شاعر اور صاحب طرز ادیب تھا، بھائیوں میں

ہمایوں، ہندال، عسکری، کامران شعر و شاعری کا اعلا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے اور آخر الذکر تو صاحب دیوان شاعر تھا، ایسے باکمال باپ اور صاحب ذوق بھائیوں کے سائے میں پلنے والی گلبدن کا ذوق علم و ادب ایک منفرد خصوصیت رکھتا ہے، جس کی زندہ و تابندہ مثال اس بیگم کے کلک گہربار سے رقم شدہ ہمایوں نامہ ہے جو فارسی نثر میں ادب عالیہ میں شمار ہونے کی چیز ہے۔

اس کتاب کی انشا پردازی کے متعلق علامہ شبلیؒ اپنے مقالات جلد چہارم میں یوں رقم طراز ہیں:

”فارسی زبان میں سادہ اور صاف واقعہ نگاری کا عمدہ سے عمدہ نمونہ تزک جہاں گیری اور رقعات عالم گیری ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتابیں سادگی اور لطافت کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ ہزاروں ظہوری اور وقائع نعمت خاں عالی ان پر نثار کر دیے جائیں لیکن انصاف یہ ہے کہ ہمایوں نامہ کچھ ان سے بھی آگے بڑھا ہوا ہے، اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے، سادہ اور بے تکلف الفاظ، روزمرہ کی عام بول چال، طرز ادا کی بے ساختگی دل کو بے اختیار کر دیتی ہے“۔

یہ کتاب جہاں گلبدن بیگم کے جادو نگار قلم کی آئینہ دار ہے وہیں اس شہزادی کے تاریخی شعور و فکری بالیدگی، تمدنی و ثقافتی، حس و وجدان کا ایک خوب صورت مرقع ہے۔

گلبدن کا ادبی مذاق صرف نثر نگاری ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ شاعری میں بھی اس کی طبع آزمائی کے نمونے ملتے ہیں اور تذکرے کی کتابوں ریاض الشعرا، مخزن الغرائب اور صبح گلشن وغیرہ میں اس کا نام شعرا کی فہرست میں درج ہے لیکن زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس کے ایک ہی شعر کا پتہ چلتا ہے:

ہر پری روئے کہ او با عاشق خود یار نیست   تو یقین می داں کہ ہیچ از عمر برخوردار نیست

یہ بات قیاس سے بعید تر ہے کہ اس درجہ کا کمال رکھنے کے بعد اس کی شکر ریز زبان سے صرف ایک شعر موزوں ہوا، جب کہ شاعری کے تمام محرکات موجود تھے اور گلبدن بیگم کا نہاں خانہ دل حقیقی اور سچے انسانی جذبات سے معمور تھا، عہد ہمایوں کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اس راز سے بہ خوبی واقف ہیں کہ ہمایوں کی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز نے پورے خاندان کو جھنجھوڑا اور دربدری کی ٹھوکر کھانے اور کبھی ایران کی خاک چھاننے اور کبھی کوہستان ہند کے دامن میں پناہ لینے

پر مجبور کیا، ان میں سے کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں گلبدن بیگم اپنے بھائی کے غم میں شریک نہ رہی ہو، اس متلاطم زندگی کے جذبات اور گرد و پیش کے ماحول نے اسے شعر کہنے پر مجبور کیا ہوگا اور اس کے ساز شاعری سے ہمیشہ نغمے پھوٹتے رہے ہوں گے مگر اس کے باوجود تذکرے و سیر کی کتابوں کے دامن میں اس کے کمال کی پونجی صرف ایک شعر کا ہونا سخت تعجب خیز ہے، ممکن ہے بعد کے دور میں کوئی محقق اس کی شاعری کے کمال کی نئی دنیا کا اکتشاف کرے۔

گلبدن بیگم کی بہن گل چہرہ بیگم کو بھی اپنے باپ بابر سے شعر و ادب کا مذاق ورثہ میں ملا تھا مگر افسوس ہے کہ اس کے متعلق بھی تذکرے کی کتابیں خاموش ہیں، سوائے ایک شعر کے اور کچھ بھی محفوظ نہیں رہ گیا، اختر تاباں اور مشاہیر نسواں میں اس کا یہ شعر مندرج ہے:

ہیچ گہ آں شوخ گل رخسار بے اغیار نیست   راست بود است آں کہ در عالم گل بے خار نیست

صبح گلشن کا مصنف صفحہ ۳۴۸ پر اس بیگم کے بارے میں یوں رقم طراز ہے:

”شگفتہ روئی و سلیقہ شاعری سرآمد زمرۂ نسواں غنچۂ دہانش بنسیم اشعار لطیف می شگفت آخر در سنہ ستہ والف اوراق گل حیاتش بباد خزاں مرگ برآشفت“۔

سلیمہ سلطان بیگم کا نام بھی تیموری شہزادیوں کی بزم ادب میں شامل ہے، یہ بابر کی نواسی اور گلرخ بیگم کی بیٹی تھی، مآثر رحیمی میں (جلد دوم، ص ۱۱) عبدالباقی نہاوندی نے لکھا ہے کہ بیگم پہلے خان خاناں بیرم کے حبالۂ عقد میں آئی، اس کے انتقال کے بعد شہنشاہ اکبر نے رفیقۂ حیات کے طور پر اس کا انتخاب کیا، فضل و کمال سے آراستہ اس خاتون کا سیاسی شعور اس دور کی شہزادیوں کے مقابلے میں زیادہ پختہ و بالیدہ نظر آتا ہے، سیاسی واقعات کی دنیا میں اس کا نام نمایاں اس وقت ہوا جب شہزادہ سلیم نے اکبر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، سلیمہ سلطان ہی کی مساعی جمیلہ سے اکبر اور سلیم میں مصالحت ہوئی، اس سلسلہ میں اکبرنامہ منتخب التواریخ، لب التواریخ میں بار بار اس کا تذکرہ آیا ہے۔

جہاں گیر جیسا قلم کا شہ زور اپنی تزک میں اس کی علمی قابلیت اور فضل و کمال کا گن گاتا ہے، مآثر الامرا، اقبال نامۂ جہاں گیری اور آئین اکبری میں اس کی سخن سنجی و شعر گوئی کا تذکرہ ہے اور مخفی تخلص بتایا گیا ہے لیکن مخزن الغرائب کے مولف کا بیان ہے کہ اس کا تخلص مخفی نہیں بلکہ تخلص

تھا، مخفی اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسا کا تھا، دیگر محققین کی یہ رائے بھی ہے کہ مخفی تخلص نام کی کئی شاعرہ ہوئی ہیں لیکن شہرت دوام نے جس کو خلود کا پیراہن عطا کیا، وہ بنت اورنگ زیب ہے۔

تذکروں میں سلیمہ سلطان کا مندرجہ ذیل صرف ایک شعر ملتا ہے:

کاکلت را من زمستی رشتۂ جاں گفتہ ام　　مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

یہ عجب اتفاق ہے کہ بیش تر تیموری شہزادیوں کے اشعار سے تذکروں کا دامن خالی نظر آتا ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان کا کلام کیوں ضائع ہوگیا، ظاہری قیاس کی بنیاد پر یہ کہنا کہ ممکن ہے کہ ان کا کلام شاعری کے اس اعلا معیار پر پورا نہ اترتا ہو جو اس دور کا طرۂ امتیاز یا معیار تھا لیکن یہ رائے خلاف انصاف ہے کیوں کہ زبان وادب کے حقیقی اور اصلی گہوارے تو شاہی محلات ہی تھے، ان کے سایے میں سانس لینے والیوں کے بارے میں یہ کہنا کہ ان میں زبان وادب کا صحیح مذاق نہیں تھا، کسی طرح بھی روا نہیں ہے۔

جہاں آرا بیگم سے کون واقف نہیں، شاہ جہاں اور ممتاز محل کی بیٹی تھی، دارا شکوہ جیسے زبان وقلم کی اقلیم کے تاج دار اور اورنگ زیب جیسے سحر طراز انشا پرداز کی بہن تھی، ممتاز محل کی گود، نور جہاں جیسی فرزانہ اور فضل وکمال میں بزم نسوانی میں یکتائے روزگار کی صحبتوں نے اس کے فکرو نظر کی مملکت کو مزید وسعت واستحکام بخشا اور اس سے بڑھ کر شاہ جہاں کے عہد کی علمی فضا نے پورے طور پر اس کے لئے یہ موقع فراہم کیا کہ وہ علم وادب کے بحر کی غواصی کرے اور اس کے موتیوں سے اپنے دماغ کو مزین کرلے، اس خوش نصیب شہزادی نے تمام امکانات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ایسا کمال بہم پہنچایا کہ آج تک میخانۂ علم کے جرعہ کش اس پر بجا طور پر ناز کرتے ہیں۔

جہاں آرا بیگم کی زیادہ تعلیم ستی النسا خانم کی آغوش میں ہوئی، جناب سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم بزم تیموریہ جلد ۳، صفحہ ۲۴۹ پر رقم طراز ہیں کہ:

"ستی النسا خانم ملک الشعرا طالب آملی کی بہن اور حکیم رکنا کاشی کی بیوی تھی، یہ خاتون حافظ تھی اور زبان دانی، ادب شناسی، طب، علم قرأت اور تجوید میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی، ممتاز محل اور شاہ جہاں دونوں اس کے قدردان تھے، جہاں آرا بیگم نے اسی خاتون کے زیر تعلیم رہ کر قرأت وتجوید سیکھا"۔

نظم ونثر دونوں میں اسے یکساں طور پر قدرت ودست رس تھی، وہ تصوف اور صوفیائے کرام کی دل دادہ تھی، ابھی اس کی عمر صرف ۲۶ سال تھی کہ مونس الارواح نامی کتاب میں مشائخ چشت کے حالات اور عقیدت واحترام سے لکھے، حضرت معین الدین اجمیری کے ذکر کی ابتدا ان اشعار سے کرتی ہے:

آں شہنشاہ جہانِ معرفت　　ذات او بیرون ز ادراک وصفت
غرق بحر عشق از صدق و صفا　　از خودی بیگانہ با حق آشنا
اختر برج سپہر لم یزل　　گوہر درج کمال بے بدل
در ثنائے او زبانم را چہ حد　　فیض او باید کہ فرماید مدد

مونس الارواح میں جا بجا اشعار درج ہیں جو خود جہاں آرا بیگم کے ہیں اور بھی مختلف تذکروں میں اس بیگم کے اشعار ملتے ہیں، چنانچہ سرخوش کی کلمات الشعرا، ریاض الشعرا اور خزانہ عامرہ وغیرہ میں موجود اشعار کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا شعری ذوق کتنا لطیف وبلند تھا، اس کی نثر میں جو دل آویزی وشگفتگی اور فقروں کی برجستگی وادائے مطلب کا انعکاس ملتا ہے، وہ نثری ادب کا عمدہ ودل کش نمونہ ہے اور ایک بیش بہا وگراں قدر اضافہ ہے، مرور زمانہ کے کتنے تھپیڑوں نے فارسی ادب کے خیمہ کو اکھاڑنا چاہا مگر جب تک فارسی زبان وادب کے عظیم ذخیرے وسرمائے کے پہلو بہ پہلو جہاں آرا بیگم جیسی گلنار قلم والیاں موجود رہیں گی زمانے کی دست برد سے یہ سرمایہ محفوظ رہے گا اور تشنگان شعر وادب کی پیاس بجھاتا رہے گا، جہاں آرا بیگم کا ذوق شعری حسب ذیل شعر سے بھی ظاہر ہے جو اس کی معمولی اور سادہ قبر پر مکتوب ہے:

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا　　کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ است

جہاں آرا بیگم کے بعد تیموری شہزادیوں کی انجمن میں فضل وکمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ فائق اور مقام بلند پر فائز اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء نظر آتی ہے بلکہ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ تیموری شہزادیوں کے علمی چمنستان کا گل سرسبد ہے جو دل رس بانو بیگم بنت شاہ نواز خاں صفوی کے بطن سے ۱۶۳۹ء مطابق ۱۰ رشوال ۱۰۴۸ھ کو دلی میں پیدا ہوئی، کلام پاک مریم زمانی عنایت اللہ کشمیری کی ماں کی سرپرستی میں حفظ کیا، مآثر عالم گیری کے مولف کا بیان ہے

کہ اس سعادت کے صلے میں عالم گیر نے زیب النساء کو تیس ہزار اشرفیاں بہ طور انعام مرحمت فرمائیں، کتب درسیہ شیخ ملا احمد جیون امیٹھوی سے پڑھیں، شعر و انشا کی تعلیم شیخ محمد سعید ماژندرانی سے حاصل کی، اس نے علم کی تکمیل کے لئے فن خطاطی میں بھی کمال حاصل کیا، مآثر عالم گیری کا مولف رقم طراز ہے کہ وہ ہر قسم کے خطوط یعنی نسخ، نستعلیق اور شکستہ نہایت خوبی کے ساتھ تحریر کرتی تھی۔

زیب النسا کو عربی و فارسی دونوں زبانوں پر دست گاہ حاصل تھی، وہ ایک جادو نگار قلم اور گل ریز زبان کی مالک تھی، اس کے خطوط و رقعات کا مجموعہ زیب المنشآت اس کی دل کش نثر کا عمدہ نمونہ ہے، اس کا ذوق شعری نہایت پاکیزہ و بلند تھا، عرفی اور حافظ شیرازی کی شاعری کی باد نسیم اس کی شاعری کے چمنستان میں انگڑائی لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، بالخصوص عرفی متوفی ۹۹۹ء کا تتبع اس انداز سے اس نے کیا ہے کہ اس کی اور عرفی کی غزلوں میں سوائے چند الفاظ کے اور کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔

زیب النسا کے بارے میں اتنا تو یقینی ہے کہ وہ قادر الکلام شاعر تھی مگر دیوان مخفی کے نام سے جو دیوان اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، اس کی نسبت محققین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ دیوان کی داخلی شہادتوں کی بنیاد پر زیب النسا کی طرف اس کو منسوب کرنا درست نہیں ہے، اس کی ایک بیاض تھی مگر اس کی ایک خادمہ ارادت فہم سے ایک حوض میں گر کر ضائع ہوگئی، بہر حال زیب النسا کے شاعر ہونے میں کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

سید لطیف نے تاریخ لاہور صفحہ ۱۴۱ پر شالامار باغ کے بیان میں لکھا ہے کہ زیب النسا قیام لاہور کے دوران ایک مرتبہ شالامار باغ کے تختۂ فیض بخش میں حرم شاہی کی دیگر مستورات کے ہم راہ بیٹھی ہوئی سنگ مرمر کی آبشار کا نظارہ کر رہی تھی، اس مسحور کن و دل ربا فضا سے متاثر ہو کر اس نے برجستہ وہیں بیٹھے بیٹھے مندرجہ ذیل قطعہ کہا:

اے آبشار نوحہ گر از بہر کیستی   چین بر جبین فگندہ ز اندوہ کیستی
آیا چہ درد بود کہ چوں ما تمام شب   سر را بسنگ می زدی و می گریستی

زیب النسا کے متعلق بے سر و پا بہت سے افسانے تراشے گئے اور اس کے عشق و معاشقے کی داستان کا صور اتنی بلند آہنگی کے ساتھ بعض غیر مسلم مورخوں نے پھونکا کہ بہت سے

مسلمان بھی اس صور کے زلزلہ خیز جھٹکوں سے عقل و خرد کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے، محمد رضا طباطبائی کی نغمہ عندلیب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، دھود یو مکرجی کا ایک بنگالی ناول بھی ملتا ہے جو اسی نوع کی تہمت طرازی پر مشتمل ہے، عاقل خاں اور زیب النسا کی کہانی بھی اورنگ زیب کے مخالفین کی اختراع ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ زیب النسا ایک خوش ذوق شہزادی تھی، اس نے شاعری بھی کی اور کتابیں بھی لکھیں، زیب التفاسیر بھی اسی کی طرف منسوب ہے، یہ اصلاً امام رازی کی تفسیر کا فارسی ترجمہ ہے، جو شہزادی کے حکم سے ملا صفی الدین اردبیلی نے کیا، مآثر عالم گیری کے مولف کا بیان ہے کہ ہنر پرور اور علم شناس شہزادی کتابوں کو جمع کرنے اور نیز جدید تصنیف و تالیف کو جاری رکھنے میں کوشاں رہتی تھی، اس کا کتب خانہ ہر حیثیت سے نادر الوجود تھا۔ ص ۳۹۴

زیب النسا کی اقلیم کمال صرف اس دائرہ میں محدود نہیں تھی کہ وہ ایک خوش گو شاعر و سخن سنج ہے بلکہ اس کے تاج کمال کی آرائش و زیبائش میں شعرا پروری اور ان کی قدر دانی بھی شامل ہے، اس کی قدر دانی ہی کا نتیجہ تھا کہ شعرا اس کو کعبۂ آمال سمجھتے تھے اور اپنے معروضات اشعار میں پیش کرتے تھے، حسب مراتب وہ ان کی حاجت روائی کرتی تھی، زیب النسا کے دربار کے شعر و شاعری کے اسی چرچے کی بنا پر علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں کہ "عالم گیر کی خشک مزاجی سے شاعری اور شعرا کو جو نقصان پہنچا تھا اس کی تلافی زیب النسا کے حسن مذاق سے ہوگئی تھی"۔

سید صباح الدین عبدالرحمان بزم تیموریہ جلد ۳، ص ۳۶۵ پر رقم طراز ہیں کہ "اورنگ زیب کی دوسری لڑکیوں کا علم و ہنر زیب النسا کی علمی شہرت کے سامنے ماند پڑ گیا ہے، حالاں کہ اورنگ زیب کی تمام بیٹیوں کو علم و ادب سے حصہ وافر ملا تھا، البتہ وہ زیب النسا کی طرح آسمان علم و ادب کی مہر و ماہ تو نہ بن سکیں مگر مختلف قسم کے علوم و فنون سے آراستہ و پیراستہ تھیں"، مآثر عالم گیر کے مولف کا بیان ہے کہ "اورنگ زیب کی لڑکیوں میں زینت النسا بیگم نے بھی باپ کی توجہ اور فیض تربیت سے علمی کمالات حاصل کیے، وہ عقائد مذہبی، احکام دینی اور مسائل شرعی سے بہ خوبی واقف و آگاہ تھی"، صبح گلشن کا مولف صفحہ ۱۹۱ پر خامہ پرداز ہے:

"زینت النسا بیگم اورنگ زیب عالم گیر کی بیٹیوں میں سے تھی، وہ

زیب النسا بیگم کی ہمشیرہ تھی، عالمہ شاعرہ اور کلام اللہ کی حافظ تھی، اس کے مزار
کے سنگ پر اسی کا مندرجہ ذیل شعر منقوش ہے:

مونس ما در لحد فضل خدا تنہا بس است   سایہ از ابر رحمت قبر پوش تا بس است"

مآثر عالم گیری کے مولف کا بیان ہے کہ اورنگ زیب کی لڑکی بدر النسا بیگم حفظ کلام اللہ
کی سعادت اور علوم دینی کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئی اور ہمیشہ علم کے ساتھ عمل کو بھی ملحوظ رکھا، عالم گیر
کی دوسری لڑکی زبدۃ النسا بیگم کے بارے میں مولف مذکور لکھتا ہے کہ ہمیشہ طاعت و عبادت و
تحصیل علم میں عمر بسر کی اور ذخیرہ سعادت فراہم کرتی رہی۔

آسائش بانو بیگم شہزادہ محمد مراد بخش کی بیٹی اور عالم گیر کی بھتیجی تھی، شاہ جہاں نے اس کی
تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی اور اس نے کمالات عملی کے حصول میں پوری تن دہی و توجہ کا
مظاہرہ کیا، آسائش بانو بیگم ابھی کمسن ہی تھی کہ فلک کج رفتار نے اس کے سر پر یہ غضب ڈھایا کہ
اس کی شفقت بھری ماں کو اس سے جدا کر دیا، عالم گیر اپنی اس بھتیجی سے بہت محبت کرتا تھا جب یہ
اولوالعزم شہزادی سن بلوغ کو پہنچی تو عالم گیر نے خواجہ محمد صالح ولد خواجہ محمد طاہر نقش بندی کے
ساتھ بڑی شان و شوکت اور تزک و احتشام سے اس کی شادی کی، محمد صالح ایک بڑا بہادر اور
شجاع شخص تھا جو ایک مدت تک عالم گیر کی جرار فوج کا سپہ سالار رہ چکا تھا۔

آسائش بانو کے علمی کارناموں اور شعر و ادب سے شیفتگی و دلدادگی سے تذکروں کے
اوراق بالکل خالی ہیں لیکن یہ بعید تر ہے کہ قصر شاہی پھر تیموریوں کے قصر و ایوان میں پلنے والی
شہزادی علم و ادب کے زیور سے عاری ہو کیوں کہ اس وقت کی فضا علم و ادب کے چرچوں سے گونج
رہی تھی اور تعلیم کے بہتر سے بہتر انتظامات کرنے کی تدبیریں اپنائی جا رہی تھیں، عہد شاہ جہانی
اور عالم گیر میں دہلی و آگرہ اور دیگر شہروں میں جہاں مردوں کے لئے مدرسوں کا جال پھیلا ہوا
تھا، وہاں خواتین کی تعلیم کا بندوبست بھی تھا البتہ آج کی طرح اجتماعی شکل کا رواج نہ تھا، سلاطین و
امرا کی بہو بیٹیاں اپنے محلات میں رہ کر بالعموم خواتین کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتی تھیں،
عالموں کا سہارا بھی لیا جاتا تھا مگر اس کی نوبت اس وقت آتی تھی جب علوم و فنون کی مشکل و دقیق
کتابوں سے واسطہ پڑتا تھا، یہ بات البتہ قابل غور ہے کہ اس دور میں عورتوں کے لئے رائج نظام

تعلیم کا عنصر غالب دینیات تھا یا ادبیات یا دونوں کا تناسب برابر تھا، اس سلسلہ میں تاریخ کی
کتابیں خاموش ہیں۔

اورنگ زیب عالم گیر کی آنکھیں بند ہوئیں کہ تخت و تاج کی خاطر کشت و خون کی ندیاں
بہائی جانے لگیں، ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک ۱۶ مغل فرماں روا تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے
مگر اکثر ایسے تھے جو شوکت تیموری اور حوصلہ بابری سے محروم تھے، بصرف نام کے بادشاہ تھے، مہم
جوئیوں کا خون ان کی رگوں میں سرد پڑ گیا تھا، محمد شاہ جس کا نام روشن اختر تھا، ۱۷۱۹ء سے
۱۷۴۸ء تک تخت حکومت پر فائز رہا لیکن ملکی نظام کو استحکام نہیں بخش سکا، عیش و عشرت کا دلدادہ یہ
بادشاہ نہ مرہٹوں کے حملوں کو دبا سکا اور نہ نادر شاہ افشار کے سیل رواں کے رخ کو پھیر سکا، اس
کے بعد ہندوستان کے تخت پر زیادہ دنوں تک جلوہ افروز رہنے والا بادشاہ عالم ثانی ہے مگر اس کی
بے کسی کا عالم یہ ہے کہ ۱۷۸۹ء میں غلام قادر روہیلہ نے اس کو اندھا کروا دیا اور اس کو اتنی قوت
حاصل نہیں تھی کہ اس سے انتقام لیتا یا اس کو سزا دیتا، حکومت مغلیہ کی بنیادیں ہل رہی تھیں، موسم
بہار کے بعد خزاں کے تند جھونکے گلستان تیموری کو اجاڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

اس طرح کے ناگفتہ بہ حالات میں علم و ادب کی ترقی کی رفتار کا متاثر ہونا طبعی امر ہے
مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ پورے طور پر اوس نہیں پڑی، پہلے کی طرح حدیث دلبرانہ کی
حرارت تو نہیں رہ گئی، تاہم علم و ادب کی بزم سونی نہیں ہوئی، تیموریوں کا جاہ و جلال آخری ہچکیاں
لے رہا تھا، خورشید اقبال عدم تدبر و تدبیر و عیش کوشیوں کے سیاہ بادلوں میں چھپا جا رہا تھا، حکومت
کے سایہ سے دور کچھ ارباب عزیمت کمر ہمت باندھے علم و ادب کا چراغ جلانے میں پوری تندہی
کے ساتھ مصروف تھے، باد صرصر کے جھکڑ بسا اوقات اتنے سخت ہوتے کہ ان قندیلوں کی حفاظت
و صیانت کے تصور سے ارباب عزیمت کا لال قلعہ ہلنے لگتا، ایک طرف یہ صورت حال تھی دوسری
طرف زوال کے سایہ میں اردو زبان نشو و نما پا رہی تھی، خانقاہوں اور صوفیوں کی آغوش میں پلنے
والی اردو اب کچھ سیانی ہو گئی تھی، شیر خوارگی کی مدت ختم ہو چکی تھی، صوفیائے اسلام نے تمدنی و
دعوتی ضرورت کے پیش نظر اس اردو کو اپنے سینے سے ایسا لگایا کہ ان کی مخلصانہ توجہ و عنایت سے
کچھ صدیوں میں جوان رعنا بن کر نمودار ہوئی اور ہر طرف اس کا استقبال کیا گیا۔

اردو زبان کی ابتدائی نشوونما: دہلی جو دارالخلافہ تھا، یہاں اس کی طرف خصوصی توجہ اس وقت شروع ہوئی جب ۱۷۲۱ء میں ولی دکنی کا دیوان بڑے آن وبان وطمطراق کے ساتھ دکن سے سفر کرتا ہوا دلی پہنچا، اس دیوان کی نفاست ولطافت، حلاوت وشیرینی، حسن وزیبائش نے سب کو متاثر کیا، سب سے زیادہ اس کی گونج لال قلعہ میں سنی گئی، ہر زبان پر بس اسی کا چرچا تھا جس کو دیکھو وہ اس کا دیوانہ وشیدا دکھائی دے رہا تھا، فارسی کا چراغ تو گل نہیں ہوا لیکن اردو کا جو طوفان اٹھا اس سے فارسی کے چراغ کی لو گاہ بجھتی گاہ سنبھل جاتی۔

بیش تر تیموری شہزادیوں نے بھی اردو زبان میں طبع آزمائی شروع کی کیوں کہ اس کے شاداب وشگفتہ چہرے کو دیکھ کر وہ سب دل دے بیٹھے، چنانچہ اس فہرست میں تیموری شہزادیوں میں سے کئی نمایاں نام نکھر کر ہمارے سامنے بے نقاب ہوتے ہیں، ان ہی میں حیا بھی ہیں، ان کا نام نواب حیات النسا بیگم عرف بھورا بیگم بنت شاہ عالم ثانی آفتاب ہے، حیا تخلص، دیگر علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ شعروشاعری کا بھی اچھا مذاق پایا تھا، ان کے والد شاہ عالم ثانی خود ایک اچھے شاعر اور شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے، باپ کے فیض صحبت پھر لال قلعہ کی ادبی فضا نے ان کے جوہر کو نکھار کر کندن بنا دیا، حیا نے شادی نہیں کی پوری زندگی یاد الٰہی میں گزار دی، عمر بھی کافی پائی، بہادر شاہ ظفر کے عہد میں انتقال فرمایا، تذکروں میں ان کے چند اشعار ملتے ہیں، دیوان کا سراغ اب تک نہیں لگا ہے، رنگ سخن یہ ہے:

آب گہر میں عکس نہاتا ہے یار کا ہے موتیوں کے ہار میں پرتو نگار کا

شعر اپنی معنوی خوبیوں اور عذوبت الفاظ میں بے مثل ہے، مضمون بھی خوب ہے، عکس یار کا آب گہر میں نہانا نہایت ہی دل نواز نکتہ آفرینی ہے۔

دوسرے شعر میں انہوں نے اپنے دور کی سماجی گراوٹ ومعاشرتی اقدار کی پامالی محاسن اور خوبیوں کے مسمار ہوتے ہوئے قلعوں کو دیکھ کر اپنے جراحت دل کا یوں نقشہ کھینچا ہے:

نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آگیا ناقص حیا ڈھونڈھے نہیں ملتی برائے نام سو سو کوس

ایک دوسری شہزادی جس نے علم وادب کی دنیا میں شہرت ونام وری حاصل کی نواب اختر محل ہیں، تذکرۂ نسوان ہند کا مولف فصیح الدین بلخی صفحہ ۳۵ پر رقم طراز ہے کہ نواب اختر

محل خاندان تیموریہ کی شہزادی ذی علم طبیعت عالی مضمون آفرینی میں یکتا اور بے انتہا نیک دل خاتون تھیں، قدسی مشہور نعت گو شاعر کی نعت[1] پر ان کا خمسہ تذکرۂ مرآۃ الخیال میں موجود ہے، رنگ سخن کے اندازہ کے لئے خمسہ کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

تجھ پہ قربان ہوں اے ہاشمی ومطلبی کہ ہے مشہور دو عالم تری عالی نسبی

دیکھو رتبہ کو ترے شوکت افلاک دبی مرحبا ، سید مکی ، مدنی العربی

غزل کے اشعار بھی خوب ہیں:

لکھ کر جدا میرا نام زمیں پر مٹا دیا ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا

اک آہ شعلہ بار نے دل کو جلا دیا لو آج ہم نے اس کا بھی جھگڑا مٹا دیا

خط لے کے نامہ بر سے جو ٹکڑے اڑا دئے غیروں نے آج ان کے تئیں کچھ پڑھا دیا

تقصیر یار کی نہ قصور عدو ہے کچھ اختر ہمارے دل ہی نے ہم کو جلا دیا

نواب عالم آرا بیگم ناز بھی ان تیموری شہزادیوں میں سے ایک ہیں، جن کے علم وادب کی کرنیں آج تک ضیاباری کررہی ہیں اور جب تک اردو زبان زندہ رہے گی، ان کے نقوش علم و ادب جاوداں رہیں گے، انقلاب ۱۸۵۷ء سے قبل قلعہ معلی کی شاعرات شہزادیوں میں انہیں بلند مقام حاصل تھا، رنگ سخن یہ ہے:

شور ہے اس کی بے وفائی کا بس نہیں چلتا واں رسائی کا

دام زلف سیاہ سے اس کی نہ بنا کوئی ڈھب رہائی کا

کر غلامی علی کی تو ، اے ناز ہے اگر شوق بادشاہی کا

نواب جینا بیگم بنت مرزا بابر گورگانی، ان کا نام قتلق سلطان تھا، شاہزادہ جواں بخت جہاں دار شاہ ابن شاہ عالم ثانی آفتاب کی محل خاص تھیں، طبع موزوں لے کر آئی تھیں، شاعری کی فصل بہار ہر دن ان کی آنکھوں کے سامنے سج سج کر آتی تھی، ظاہر ہے کہ طبعی مناسبت کے گلوں کے نکھار کا موسم عندلیب شاعری کو نوا پیرا ہونے پر مجبور کر ہی دیتا ہے، ان کے ساز شاعری سے ابھرنے والے نغمے آج تک چمنستان ادب میں گل وبلبل کی حسین داستان سنا رہے ہیں، تذکروں میں ان

---

[1] معارف: اب تحقیق ہو چکی ہے کہ یہ نعت قدسی کی نہیں ہے، ملاحظہ ہو معارف۔

کا جو کلام پایا جاتا ہے وہ مقدار میں کوئی زیادہ نہیں ہے مگر جتنا ہے وہ عمدہ اور صاف ستھرا و نتھرا ہے، ضیافت طبع کے لئے یہ تین متفرق اشعار پیش ہیں:

روٹھنے کا عبث بہانا تھا — مدعا تم کو یاں نہ آنا تھا

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے — کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے

نہ دل کو چین نہ دل کو قرار رہتا ہے — تمہارے ملنے کا نت انتظار رہتا ہے

تیموری شہزادیوں نے فکر وفن اور علم وادب کی جو بزم سجائی تھی، عہد بہ عہد اگر اس کے حقائق و موثرات کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ آغاز کا دور آسمان کی بلندیوں کو چھونے کے لئے بے تاب و بے قرار نظر آتا ہے، جس کا سلسلہ اورنگ زیب عالم گیر تک جا کر منتہی ہوجاتا ہے، اس کے بعد تیموریوں کی جلائی ہوئی تہذیبی شمع کی لو ماند پڑنے لگتی ہے فکر وفن خورشید جہاں تاب سے نظریں چرا کر کسی شام کے صحرا میں چھپ جانے کے لئے کوشاں دکھائی دیتے ہیں، خاندان تیموری کی علمی وادبی کہکشاں بڑی حد تک بے رونق ہوچکی تھی اگرچہ کچھ اچھے اور صاحب دیوان شاعر ضرور ہوئے مگر ڈیڑھ سو سال کے طویل عرصہ میں تیموریوں کی بزم علمی میں چھائی ہوئی اداسی ایک باغیرت، صاحب ضمیر کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ اسی عہد میں شاہان تیموریہ کی سرپرستی میں شعر وادب کی جڑیں مضبوط ہوئیں، اردو زبان کو استحکام و فروغ نصیب ہوا، ان کی قدر دانی نے شعرا اور اہل علم کے حوصلوں کو موجوں کی روانی اور باد نسیم کی نکہت بیزی عطا کی، یہی وہ دور ہے جس کی چمن آرا و بہار آفریں فضا میں ولی، سراج، سودا، میر درد، میر سوز، میر تقی میر، میر حسن، سید انشا، مصحفی، مومن، غالب، جرأت، آتش، ذوق وغیرہ نے نغمہ سنجی کی اور پرورش لوح وقلم کرتے رہے یا غالب کی زبان میں حکایات خون چکاں لکھتے رہے، تیموریوں کے دور حکومت میں دربار شاہی میں شعرا اپنا کلام پیش کرکے داد وتحسین وستائش وصلہ سے مالا مال ہوتے تھے، انفرادی طور پر شہزادیاں بھی شعرا کو انعام واکرام سے نوازتی تھیں لیکن اس کا سراغ نہیں ملتا کہ شہزادیوں کے محلات میں بھی مشاعرے منعقد ہوتے تھے یا خواتین کبھی یکجا ہوکر شعر وسخن کی محفل آراستہ کرتی تھیں، قیاس تو کہتا ہے کہ ابتدائی دور میں ایسا نہیں تھا مگر جب تیموریوں کی رگوں میں مہم جوئی کا خون سرد پڑ گیا، عیش

وعشرت کے اسیر ہوگئے، ان کے شب وروز آرائش وزیبائش کی نذر ہونے لگے، فنون لطیفہ نے ان کی زندگی کو طاؤس ورباب کی زنجیر میں جکڑ دیا تو مردوں کے پہلو بہ پہلو خواتین کی دلچسپی کا بھی سارا سامان یہی رہ گیا تھا کہ وہ شعر وادب اور دیگر مشغلوں سے جی بہلائیں۔

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد تیموری شہزادیوں نے شعر وشاعری سے اپنی شیفتگی کو برقرار رکھا اور طبع آزمائیاں بھی کرتی رہیں مگر ان کی کوئی قابل ذکر علمی وادبی تصنیف نہیں ملتی، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس عہد میں بیشتر توجہ کا مرکز بلکہ معراج کمال شعر وشاعری ہی تھا، جس نے ان کو نثر کی طرف عنان خیال موڑنے کا موقع نہیں دیا۔

صاحبانِ قلم علمائے اکبر آباد

از:- ڈاکٹر سید اختیار جعفری ☆

ہندوستان کا سابق دار السلطنت آگرہ (یادش بخیر...... اکبر آباد) علم و ادب اور تصوف کا بھی عظیم مرکز رہا ہے، اردو زبان کی تشکیل وارتقا میں بھی آگرہ کا نمایاں حصہ ہے، جس دور میں کہ اردو زبان فارسی سے الگ منفرد شناخت قائم کررہی تھی، علم و ادب کا مرکز آگرہ ہی تھا، اکبر آباد یا آگرہ نہ صرف مستقبل کی اردو زبان کی شیرینی، موسیقیت اور لطافت کا گہوارہ رہا بلکہ اردو شاعری کے شمالی ہند میں آغاز کا سہرا آگرہ کے ہی سر ہے، تحقیقی طور پر یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اردو زبان کی تشکیل عہد سکندر لودی میں شروع ہوئی، جبکہ دار السلطنت آگرہ تھا، اردو زبان نے ادبی حیثیت مغلیہ عہد کے وسط اور اوائل میں اختیار کرنا شروع کی تھی، یہ دور جو ہمایوں، اکبر، سلیم جہاں گیر اور شاہ جہاں پر مشتمل ہے، دراصل اردو زبان وادب کی ترویج کا دور ہے اور اس کا سلسلہ بھی آگرہ سے ہی شروع ہوا۔

اردو زبان کے سب سے پہلے باقاعدہ مصنف وادیب اور شاعر سراج الدین علی خان آرزو، آگرہ کے ہی تھے، ان کے بعد کے اساتذہ میں قطب الدین باطن، نیاز علی پریشاں، ڈپٹی سر سید امداد علی، میر ناصر علی دہلوی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں، ان کے بعد کے دور میں اردو زبان کے خدائے سخن میر تقی میر، خدائے نظم نظیر اکبر آبادی اور ناخدائے سخن مرزا غالب کا تعلق بھی آگرہ سے ہی ہے، خان آرزو سے لے کر اس طبقہ دوم تک آگرہ میں کم از کم تین درجن قدآور صاحب علم وقلم کے نام ملتے ہیں۔

صرف زبان وادب ہی نہیں آگرہ تعلیم وتدریس اور تصوف کا بھی اہم مرکز رہا ہے، تیسری

☆18/147، خیرادی ٹولہ، تاج گنج روڈ آگرہ، 282001۔

صدی ہجری سے ہی یہاں صاحبانِ تصوف یا علمائے طریقت کے تذکرے ملتے ہیں، آگرہ کی سرزمین میں سینکڑوں صوفیا اور ہزار ہا علما استراحت فرما ہیں، حضرت شیخ سلیم چشتی، سیدنا امیر ابو العلا، سید عبداللہ احراری، سید فتح الدین بلخی عرف تارا شاہ چشتی صابری، میر رفیع الدین محدث اکبر آبادی، مفتی ناصرا اکبر آبادی وغیرہ یہاں کے نہایت نام ور علما وصوفیا ہوئے، ایسے ہی چند اہل علم صوفیا کا تذکرہ اس مضمون میں کیا گیا ہے، انتخاب صرف صاحب علم وفضل اور ماہرین شریعت کا کیا گیا ہے۔

مفتی ابوالفتح اکبر آبادی المکی: مفتی صاحب موصوف شروان میں پیدا ہوئے، ابتدائے عمر میں ہی مکہ مکرمہ چلے گئے تھے، وہاں تقریباً ۳۸ سال قیام رہا، اسی وجہ سے مکی مشہور ہوئے، مکہ مکرمہ میں شیخ اسید الخلیفہ، ابوالعباس الاخریٰ، شیخ عبدالرحیم الاشتری، امام الحرم الشیخ عبداللہ الحضیر وغیرہم سے اصول، فقہ، تفسیر، حدیث اور ادب کی تعلیم حاصل کی، سلطان سکندر لودی کے عہد میں ۱۴۹۷ء میں وارد سندھ ہوئے، آپ کے علم وفضل کی شہرت سن کر بادشاہ نے اشتیاق ملاقات کا عریضہ بھیج کر آگرہ بلوایا، ان کے ساتھ عاجزی اور محبت کے ساتھ پیش آیا، اسی کی درخواست پر آپ نے آگرہ میں قیام کو منظور کرلیا، بادشاہ آپ سے اس حد تک سلوک کرتا تھا کہ بعض امرا اس سے رشک میں جل مرے، ایک حاسد نے آپ کی تحریر کی نقل کرکے ایک خط سلطان کے دشمن کے نام بنا کر اس طرح روانہ کیا کہ وہ بادشاہ کے پاس جا پہنچا، بادشاہ نے وہ خط آپ کے پاس بھیج دیا، آپ نے کہلا بھیجا کہ ابوالفتح ایسا نالائق انسان نہیں کہ ایسی بے ہودہ تحریر سے اپنے قلم کو ملوث کرکے دل آزاری روا رکھے، انشاء اللہ اس کا ذمہ دار شخص جلد ہی کیفر کردار کو پہنچے گا، ایک ہفتہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ایک بدمست اونٹ نے اس شخص کا ہاتھ چبالیا، جب سلطان ابراہیم لودی بابر کے مقابلے کے لئے پانی پت کی جانب روانہ ہوا تو دیگر علما اور مشائخ کے ہم راہ آپ بھی اس کے ساتھ تھے لیکن راہ میں از راہ کشف آپ کو علم ہوا کہ خداوند کا عتاب اس لشکر پہ ہونے والا ہے، لہذا آپ اس سے الگ ہوکر واپس لوٹ آئے، شیر شاہ سوری بھی آپ کا معتقد تھا، پورن مل والی ریاست رائے سین جس نے چندیری کو غارت کرکے ہزاروں مسلمان شرفا وعلما کو تباہ کردیا اور ہزاروں خواتین کو اپنے حرم میں داخل کرلیا تھا، ۹۵۰ھ میں آپ ہی کے

فتوے پر ہاتھیوں کے پیروں سے کچلوا کر ہلاک کیا گیا، ۱۳۴ برس کی عمر پائی، باختلاف روایات ۲۲ رشعبان یا ۲ رذوالحجہ ۹۵۳ھ کو آگرہ میں رحلت ہوئی، میر رفیع الدین محدث صفوی نے نماز جنازہ پڑھائی، مزار مبارک محلہ گھائی ماموں بھانجہ میں تھا، اب ختم ہوگیا۔

صاحب تصانیف تھے، آپ نے علم کلام میں ایک عربی رسالہ الفوائد الکلم لکھا تھا، تفسیر بیضاوی کا درس دیتے ہوئے ایک کتاب اصول تفسیر میں تیسیر القرآن تصنیف کی تھی، یہ کتاب ۱۳۰ صفحات پر فارسی میں ہے، جس پر سید رفیع الدین محدث اکبرآبادی نے دو جز کا مقدمہ تحریر کیا تھا، ان کی دیگر کتابوں میں الکافی، ہدی للمتقین، العلم الانساب والافراس اور الصحابۃ الکبار کے نام ملتے ہیں (۱)۔

مفتی حکیم ابوالفتح: حضرت حکیم مفتی عبدالقدوس ابوالفتح تھانیسر کے باشندے تھے، آپ کے والد کا نام شیخ عبدالغفور ابن شیخ شرف الدین فاروقی تھا، علم منقولات میں قاضی محمد فاروقی اور معقولات میں حاجی حسن بکری سے جب کہ طب میں مولانا مولوی ابوغدہ سے کمالات کا درجہ حاصل کیا تھا، سلطان سکندر لودی کے عہد میں تھانیسر سے براہ دہلی وپلول دارالخلافہ اکبرآباد میں وارد ہوئے، اس وقت آپ کا عالم جوانی تھا، یہاں آکر اولاً میر رفیع الدین صفوی محدث اکبرآبادی سے سند حدیث حاصل کی، یہیں حکمت میں مہارت حاصل کی، حالاں کہ طبابت کو پیشہ نہیں بنایا، ۵۰ برس تک میر موصوف کے محلے میں علوم نقلی وعقلی کا درس دیتے رہے، ہزاروں لوگوں نے اکتساب علم کرکے درجۂ کمال حاصل کیا، میاں کمال الدین حسین شیرازی، شیخ افضل محمد انصاری، قاضی ناصر اکبرآبادی، حاجی ابراہیم سرہندی اور ملا عبدالقادر بدایونی جیسے صاحبان علم وفضل آپ کی ہی شاگردی میں رہ کر استادان ہفت اقلیم ہوئے، ۸ رجمادی الاول ۹۷۶ھ کو راہی فردوس بریں ہوئے، آپ کی تاریخ رحلت "موت مفتی" سے برآمد ہوتی ہے، آپ کے ایک صاحب زادے شیخ عیسی کا نام ملتا ہے، آپ کی ایک کتاب "الانتشار" کا نام ملتا ہے لیکن اس کی کیفیت نامعلوم ہے (۲)۔

سید ابوالعلاء انسان اکبرآبادی: سیدنا امیر ابوالعلاء احراری نقش بندی سلسلۂ ابوالعلائیہ کے بانی ہیں، آپ عہد جہاں گیری کے سربرآوردہ صوفیائے طریقت میں سے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، سیدنا ابوالعلاء کے صاحب زادے حضرت ابوالقاسم سے بھی بیعت تھے،

آپ کا سلسلۂ نسب ۲۹ واسطوں سے حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے، نسب نامۂ مادری غوث الابرار حضرت خواجہ عبیداللہ احرار تک پہنچتا ہے، آپ کے جد بزرگوار امیر عبدالسلام ابن امیر عبدالملک ابن امیر عبدالباسط ابن امیر تقی الدین کرمانی شہنشاہ اکبر کے عہد اواخر میں اپنے وطن سمرقند سے ترک وطن کرکے مع اہل وعیال ہندوستان آئے اور دہلی کے نزدیک واقع نریلہ میں قیام کیا، یہیں ۹۹۰ھ میں ابوالعلاء کی ولادت ہوئی، اکبر اعظم کے اصرار پر امیر عبدالسلام نے فتح پور سیکری پہنچ کر قیام فرمایا، بعد ازاں حج کے لئے حرمین گئے اور وہیں سفر آخرت اختیار فرمایا، آپ کے والد امیر ابوالوفا بہ دستور فتح پور سیکری میں مقیم رہے، وزیر اعظم مرزا راجہ مان سنگھ کو آپ سے خصوصی عقیدت ومحبت تھی، ابوالعلاء کے بچپن میں ہی ان کے والد کا انتقال ہوگیا، آپ کی تعلیم وتربیت آپ کے نانا خواجہ فیضی ابن خواجہ ابوالفیض ابن خواجہ محمد عبداللہ احرار کی زیرنگرانی ہوئی، خواجہ فیضی گورنر بنگال کی طرف سے علاقہ بردوان کے ناظم مقرر تھے، ایک جنگ میں خواجہ فیضی شہید ہوئے تو ان کی جگہ آپ کو ناظم بردوان بنادیا گیا لیکن یہ دنیوی امور سے متوحش رہتے تھے، روایت ہے کہ ایک شب آپ کو تین بزرگوں نے ہدایت دی کہ عبادت وریاضت میں مشغول ہوں، بہ مشقت تمام یہ عہدہ چھوڑا، حضرت شاہ دولت منیری (قصبہ منیر) سے اکتساب فیض کیا، حضرت علی، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ نظام الدین اولیا کی غائبانہ ہدایات پر آگرہ آئے اور اپنے عم بزرگوار سید امیر عبداللہ نقش بندی سے بیعت ہوکر خرقۂ اجازت وخلافت حاصل کیا۔

آپ جامع کمالات بزرگ تھے، صرف رہرو طریقت نہیں پابند شریعت بھی تھے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے انفاس العارفین میں اس پر کافی روشنی ڈالی ہے، ۷۱ برس کی عمر میں بہ عارضۂ حرقت البول بہ روز سہ شنبہ ۹ رصفر المظفر ۱۰۶۱ھ کو انتقال ہوا، آگرہ بائی پاس روڈ پر آپ کا مزار مرجع خلائق ہے، آپ کا سلسلۂ تصوف بنگلہ دیش اور سری لنکا و پاکستان تک وسیع ہے، انگلینڈ، امریکہ، پاکستان، میاں مار وغیرہ میں بھی آپ کے وابستگان بڑی تعداد میں رہتے ہیں، ہندوستان میں اس سلسلے کے اہم مراکز حیدرآباد، برہان پور، رام پور، اورنگ آباد، کالپی، خیرآباد، دہلی، بنگال، داناپور (بہار)، الہ آباد، بختیارنگر (لکھنؤ)، بگڑ (جھنجھنو راجستھان)، الور،

گوالیار اور نارنول وغیرہ ہیں۔

سیدنا امیر العلاء احراری شاعر تھے، انسان تخلص کرتے تھے، ان کے اشعار فارسی ان کے رسالہ فنا و بقا میں دیکھے جاسکتے ہیں، ان کے علاوہ متعدد اردو اشعار بھی کہے ہیں جو اس وقت دست یاب نہیں، فارسی اشعار بہ طور نمونہ:

صیاد ازل کہ دانۂ و دام نہاد مرغے بگرفت و آدمش نام نہاد
ہر نیک و بدے کہ در جہاں می گذرد خود می کند و بہانہ بر عام نہاد
ناوک اندر کمانِ خود دارد شاہداں را بہانہ درا برد
نکو گوئی نکو گفت است بالذات کہ التوحید اسقاط الاضافات
ایں ہمہ طمطراق کن فیکون ذرہ نیست نزد اہل جنوں
دردم از یارست و درماں نیز ہم دل فدائے او شد و جان نیز ہم
سر رشتۂ نسب بہ علی ولی رسید انسانؔ تخلصم شدہ نامم ابو العلاء

آپ کی ایک کتاب "رسالہ فنا و بقا" موجود ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب تصوف کے مراحل "فنا" اور "بقا" کی تلاش، طریقہ، اللہ کی ذات کے استحضار اور مختلف باطنی معاملات کے سلسلے میں ہے، یہ ایک مختصر کتاب ہے لیکن اس کی قدر و قیمت اہل تصوف اور اہل علم کے نزدیک متفقہ طور پر کافی اہم ہے، اس کو پروفیسر نذیر احمد نے ایڈٹ کر کے مجلۂ تحقیق پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں شائع کرادیا ہے، اس کے علاوہ ایک دیوان شاعری کا نام ملتا ہے لیکن راقم الحروف کو اس کی زیارت نصیب نہیں ہوسکی، آپ کے چند مکاتیب کا مجموعہ بھی ہے جس میں شریعت و طریقت کے مختلف مسائل پر اظہار خیال ہے(۳)۔

شیخ بایزید: حضرت شیخ بایزید شروانی آگرہ کے اہم صوفیا میں ہیں، سلسلۂ نقش بندیہ میں حضرت سید ولی چھتا ولی سے بیعت تھے، آزادہ دلی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، عموماً جذب طاری رہتا، گریۂ قلبی سے معمور رہتے تھے، دسویں صدی ہجری کے اواخر میں رحلت کی، آپ کا مزار موضع سنکن نزد گنبد تخت پہلوان دیوری روڈ آگرہ پر تھا، اب نام و نشان مٹ چکا ہے۔

شیخ بایزید خویشگی: آپ عہد عالم گیری کے ایک صاحب نسبت اور واقفِ حقیقت

بزرگ تھے، ۱۰۹۸ھ میں راہیٔ دار السرور ہوئے، قطعۂ تاریخ وفات:

چوں گذشت از دارِ فانی بایزید یافت قصرِ جاودانی بایزید
سال نقلش مظہر الحق زد رقم شد ز آفاق آہ ثانی بایزید
۱۰۹۴ھ (۴)

اسدیار خاں انسانؔ اکبر آبادی: اسدیار خاں انسانؔ اکبر آبادی عہد محمد شاہ بادشاہ کے ممتاز شاعر ہیں، ان کا نام اسدیار خاں تھا، محمد شاہ نے انہیں اسد الدولہ کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب مع لوازمات سے سرفراز کیا تھا، افسران شاہی میں ان کی انفرادیت قابل ذکر ہے، پورے شاہی کروفر کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، پیدائش دہلی میں ہوئی لیکن ابتدائے شباب میں ہی آگرہ آگئے تھے، عمر کا بیشتر حصہ یہیں گزارا لیکن انتقال دہلی میں ہی ہوا، فتح علی گردیزی نے لکھا ہے کہ منصبی ذمہ داریوں کے ساتھ ان کی شاعری بھی چلتی رہی، موزوں طبع تھے، تصوف کا غلبہ تھا، عموماً اسی رنگ میں کہتے تھے، ہر چند کہ امارت دروازے کی لونڈی تھی لیکن انہوں نے کبھی فخر و غرور نہیں کیا، عالم شباب میں تقریباً ۳۳ برس کی عمر میں انتقال ہوا، نمونۂ کلام:

اگرچہ ہر بُنِ مو سے بدن سارا شب کا ہے نہ دیکھی ایک جھلک بھی آپ کے تن بیچ اندھوں میں
زمین اور آسماں اور مہر و مہ سب تم میں ہیں انسانؔ نظر بھر دیکھ مشتِ خاک میں کیا کیا جھمکا ہے (۵)

ملا ولی محمد ولیؔ اکبر آبادی: آپ علم و فضل سے موصوف اور سید شاہ ابو العلاء احراری نقش بندی کے خلفائے اعظم اور یارانِ جاں نثار میں سے تھے، جو نسبت حضرت شیخ نصیر الدین کو حضرت نظام الدین کے خلفا میں تھی وہی نسبت آپ کو خلفائے ابو العلاء میں تھی، آپ صاحبِ علم و فضل، عالم باعمل، عارف باللہ، عاشق رسول اور استاذِ زماں تھے، میر ابو العلا کے صاحب زادے ابو القاسم کو آپ کی شاگردی کا فخر حاصل ہے، ذاتی سوانح حاصل نہ ہوسکے، آپ استادِ حدیث و ادب تھے، فارسی ادب میں خصوصی امتیاز حاصل تھا، مدرسہ عالیہ جامع مسجد آگرہ میں عربی و فارسی کے استاد تھے، آپ کے زیر ادارت ایک رسالہ "الشہید" نائی کی منڈی آگرہ سے نکلتا تھا، مثنوی مولانا روم کی شرح اردو میں لکھی ہے، یہ کتاب سینٹ جانس کالج آگرہ کی سینٹرل لائبریری میں موجود ہے، غالباً ۱۰۷۰ھ میں انتقال ہوا، آپ کا مزار لب سڑک پختہ محلہ بالوگنج آگرہ میں تھا، اب

نام ونشان مفقود ہے، آپ شاعر بھی تھے اور فارسی میں ولی تخلص کرتے تھے لیکن کلام دست یاب نہ ہوسکا(۶)۔

حواشی

(۱) مولانا سعید احمد مارہروی: بوستان اخیار المعروف مشاہیر آگرہ، مطبوعہ ابوالعلائی اسٹیم پریس آگرہ، ۱۳۱۳ھ، ص ۳۳، مخبر الواصلین، ص ۵۷، تذکرۂ مشاہیر، ص ۹۸، طبقات ناصری، ص ۳۴، تذکرہ علمائے ربانی، ص ۱۰۶۔

(۲) ایضاً۔

(۳) مولانا مفتی انتظام اللہ شہابی: تذکرۂ مشاہیر اکبر آباد، ص ۶۔

مولانا سعید احمد مارہروی: بوستان اخیار، ص ۱۵۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی: انفاس العارفین۔

ماہنامہ مشورہ آگرہ نمبر: جون ۱۹۳۷ء، ص ۱۴۔

مولانا شاہ محمد قاسم داناپوری: نجات قاسم، ص ۴۸۔

مرزا حمید الدین بیگ: اسرار ابوالعلاء، جدید ایڈیشن، جون ۱۹۹۶ء، ص ۹۴۔

(۴) مولانا سعید احمد مارہروی: بوستان اخیار، ص ۵۳۔

(۵) میر تقی میر: نکات الشعرا، ص ۱۲۴۔

فتح علی گردیزی: تذکرۂ ریختہ گویاں، ص ۴۸۔

لالہ سری رام: خم خانہ جاوید، جلد اول، ص ۴۶۶۔

ڈاکٹر سید اختیار جعفری: تذکرۂ شعرائے اکبر آباد، جلد اول، ص ۴۸۔

(۶) مولانا سعید احمد مارہروی: بوستان اخیار، ص ۲۴۷۔

☆☆☆☆

اخبار علمیہ

علوم مشرقیہ کے ماہر پروفیسر G. Lobzhnidze نے قرآن مجید کا جارجین زبان میں ترجمہ کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ اس میں انہوں نے کئی برس صرف کیے اور اس کے لئے متعدد اسلامی ملکوں ایران، مصر اور ترکی وغیرہ کے سفر بھی کیے، تبلسی کی ایک تقریب میں جو ایک غیر سرکاری ادارے کا زاکس ہاؤس منعقد ہوئی تھی میں انہوں نے اس ترجمہ کو پیش کیا جس میں جارجیا کی مسلم کمیونٹی کے نمائندوں، ٹرکش، ازری اور ایرانی سفرا کے علاوہ قابل ذکر عیسائی مذہبی علما اور دوسرے اہل علم نے شرکت کی۔

استنبول کی سلیمانیہ لائبریری قدیم اسلامی کتب اور نادر مخطوطات کا بڑا مرکز ہے، اب اس کی نگہ داشت وتحفظ کے لئے وہاں ایک شعبہ کا قیام عمل میں آیا ہے، جس میں کتابوں کے تحفظ اور نگرانی کے جدید طریقوں کی عملی تربیت دی جائے گی، یہ شعبہ ارسیسا اور یونیسکو کے تعاون سے ترکی کی وزارت تہذیب وثقافت نے قائم کیا ہے، لائبریری کی اہمیت وعظمت کے پیش نظر تحفظ کتب کے لئے اس کا انتخاب عمل میں آیا ہے، اسی سلسلے کی ایک میٹنگ جنیوا میں یونیسکو کے صدر دفتر میں ہوئی جس میں ایک سہ فریقی معاہدہ پر دستخط بھی کیے گئے۔

ملی گزٹ دہلی میں سماجی فلاح وبہبود کے وزیر کا یہ تحریری بیان شائع ہوا ہے کہ ملک میں کل ۲۷۵۶۱ مدرسے ہیں جو اکثر مدھیہ پردیش اور کیرالا میں ہیں لیکن ان میں زیادہ تر مدرسوں کے نصاب کی تفصیل مرکزی حکومت کو مہیا نہیں کی گئی ہے اور جدید علوم جیسے سائنس، ریاضی اور انگریزی وغیرہ صرف انہیں مدرسوں میں داخل نصاب ہیں جو حکومت سے منظور شدہ ہیں، باقی میں یہ مضامین زیر درس نہیں ہیں، کشمیر، ہماچل پردیش، میگھالیہ، ناگالینڈ اور پانڈیچری وغیرہ سے اطلاع ملی ہے کہ ان کے یہاں مدرسے تو نہیں ہیں البتہ ۸۶ پرائیوٹ تعلیمی ادارے ہیں جو وقف بورڈ کے زیر انتظام چل رہے ہیں، مدارس کی تعداد یوپی میں ۴۲۹۲، بہار میں ۴۱۰۲، پنجاب میں ۱۹۸۵ اور گجرات میں ۱۷۲۷ ہے، مرکزی حکومت کے مدرسوں کی جدید کاری کے

پروگرام کے تحت ۵۱۱۸ مدرسوں کے لئے ۰۷-۲۰۰۶ء میں ۳۸،۳۵ کروڑ روپے مختص کیے تھے جو اس سال کی ابتدا ہی میں ۱۶ کروڑ خرچ ہوچکے ہیں۔

"وکالۃ الانباء الاسلامیہ" کی اطلاع ہے کہ سعودی حکومت نے بلقان میں عربی زبان کے فروغ و اشاعت کے لئے متعدد ادارے قائم کیے ہیں جن میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں، مرکز خادم الحرمین الشریفین الثقافی (سراجیو) اکادیمیۃ الامیر سلیمان بن عبدالعزیز (بیہاچ)، مرکز الثقافی السعودی (مرستار)، مرکز وجامع سیرۃ الجوہرہ (بوغوبنو) اور مدرسۃ دار الوالدین لایتام، اس کے علاوہ بوسینیائی طلبہ کی قابل ذکر تعداد جامعۃ الامام محمد بن سعود، جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ وغیرہ میں زیر تعلیم ہے اور عربی زبان وادب سیکھ رہی ہے، عربی سکھانے کے لئے سفیر برائے ایران احمد خلیلوفیتش نے "تعلیم اللغۃ العربیۃ اور العربیۃ بین یدیک" نام سے کتابچے تحریر کیے ہیں۔

اردن میں منعقدہ "عالمی اقتصادی فورم" کے موقعے پر دبئی کے گورنر محمد بن راشد المکتوم نے مشرق وسطی میں جدید اور سائنسی علوم پر کام کرنے والوں کے لئے دس ملین امریکی ڈالر کی امداد کا اعلان کیا ہے، تاکہ ان علاقوں میں نئے علوم اور سائنس سے لوگوں کی دلچسپی اور شرح خواندگی میں اضافہ ہو، کہا جاتا ہے کہ مشرق وسطی میں ۴۰ % عورتیں تعلیم سے نابلد اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتیں، رپورٹ میں یہ افسوس ناک خبر بھی ہے کہ پوری عرب دنیا میں شائع ہونے والی کتابوں کے برابر صرف ایک ملک ترکی میں کتابیں شائع ہوتی ہیں اور سائنسی تحقیقات پر عرب ممالک میں جس قدر رقم خرچ ہوتی ہے وہ ترقی یافتہ ملکوں میں خرچ ہونے والی رقم کا انتہائی معمولی حصہ ہے، اس موقع پر "شیخ محمد بن راشد المکتوم فاؤنڈیشن" کا قیام بھی عمل میں آیا ہے جو اعلان شدہ رقم کے خرچ کی نگرانی کرے گا۔

برطانیہ کے دفتر قومی اعداد وشمار کے مطابق وہاں رکھا جانے والا سب سے محبوب نام Jack ہے اور محمد نام کی مقبولیت نے برطانیہ کے مقبول ترین ناموں تھامس، جوشوا اور اولیور کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور دن بہ دن اس کی مقبولیت میں اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے، پچھلے سال اس کے تناسب میں ۱۲ فی صد اضافہ ریکارڈ کیا گیا تھا اور سال رواں کے اخیر تک توقع ہے کہ وہاں کی مجموعی آبادی میں رکھے جانے والے ناموں میں "محمد" نام پہلی پسند بن جائے گا۔

تھائی لینڈ میں اکثریت بدھسٹوں کی ہے لیکن بودھ مذہب کو وہاں کے قانون میں سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل نہیں ہے، پچھلے دنوں جب وہاں کے بدھسٹوں نے اس کے لئے حکومت سے مطالبہ کیا تو تھائی لینڈ حکومت نے ان کی عرضی خارج کردی، حکومت کے اس فیصلے کے خلاف بودھ مذہب کے لوگ مظاہرے اور بھوک ہڑتال کررہے ہیں، جب اس مسئلے کے تصفیے کے لئے ووٹنگ کرائی گئی تو اس کے خلاف ۶۶ فی صد اور اس کے حق میں ۱۹ فی صد ووٹ پڑے، وہاں کی قانون ساز اسمبلی کے ایک فرد نے کہا کہ مذہب کا مسئلہ نہایت حساس ہوتا ہے، اس کے لئے چوں کہ قانون میں کوئی آرٹیکل نہیں ہے، اس لئے ہمارے خیال میں اس آواز کو موثر بنانا حکومت کے حق میں غیر مفید وغیر مستحسن ہوگا لیکن تجزیہ نگاروں نے اس کے برعکس ایک انتباہ یہ دیا ہے کہ اگر بودھ کو سرکاری حیثیت حاصل ہوگئی تو وہاں کے مسلمانوں کے مطالبات بھی شروع ہوجائیں گے، جن کی تعداد بھی معتد بہ ہے، اس طرح کی خبریں بھی موصول ہورہی ہیں کہ وہاں علاحدگی پسندوں کا گروہ بھی سر اٹھانے کی کوشش میں ہے۔

چینی ماہرین نے ملازمین کے لئے "مائیکروسافٹ آفس بس" نام کی ایک بس تیار کی ہے جس میں تمام آرام دہ سہولتوں کے ساتھ اس بات کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ اگر کسی ملازم کے آفس کا کام نامکمل رہ گیا ہے تو وہ اس کو اس بس میں کمپیوٹر کی سہولت کے سبب پورا کرسکتا ہے، خاص ملازمین کے لئے تیار کی جانے والی یہ بس اپنی نوعیت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے پہلی اور منفرد بس ہے۔

منگولیا میں چینی سائنس دانوں کو ۷۰ ملین برس قبل کے ایک دیو پیکر پرندہ نما ڈائنا سور کے باقیات ملے ہیں، اس کے باوجود ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کی ابھی مکمل طور پر افزائش نہیں ہوئی تھی، ۱۶ فٹ اونچے، ۲۶ فٹ لمبے اس پرندہ نما ڈائنا سور کا وزن تین ہزار پونڈ ہے، اس کے پنجے طویل اور پورا جسم پروں سے ڈھکا ہوا ہے۔

شمسی توانائی سے چلنے والی اسکوٹر ملیشیا کی ایک کمپنی Sularian Turtule نے تیار کی ہے، اس کی رفتار 55 MPH یعنی تقریباً ۹۰ کیلو میٹر ہے، یہ تیل کے بجائے سورج کی کرنوں سے چلنے والی دنیا کی پہلی اسکوٹر ہے، اندازاً اس کی قیمت ۸۲۰ امریکی ڈالر ہے۔

ک۔ ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

مسلمانوں کی تعلیم

۱/۸ ۔ عبدالحلیم لین، کولکتہ
۲۰۰۷/۶/۱۹

محترمی جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب!

السلام علیکم!

۲ روز پیشتر ایک پیکٹ ملا، کھولنے پر معلوم ہوا کہ ”مسلمانوں کی تعلیم“ نامی کتاب ہے، یہ موضوع ایسا ہے کہ فوراً پڑھے نہ رہ سکا، صفحہ ۴۵ تک فوراً پڑھ ڈالا، اگر آنکھوں میں تکلیف نہ ہوئی ہوتی تو دل چاہتا تھا کہ پوری کتاب پڑھ ڈالوں۔

اس کی قیمت بھی کچھ لکھی ہوئی نہیں ہے، خرچ تو ہوا ہوگا، بہرحال میں انشاء اللہ کل ۱۰۰۰ کا ڈرافٹ روانہ کررہا ہوں، میں شاید ۲۵-۳۰ سالوں سے آپ کے رسالہ ”معارف“ کا لائف ممبر بھی ہوں، وصول یابی سے مطلع فرمائیں گے۔

اگر کوئی ایسا نیک کام ہو تو مجھے بھی یاد فرمائیے گا، انشاء اللہ تعمیل کروں گا۔

ہاں! مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی صاحب ان دنوں کافی علیل ہیں، دعا فرمائیے گا۔

نیازمند
فیضان احمد

مطبوعات جدیدہ

قرآن مجید کے دو باب الفاتحہ والبقرہ: از جناب مولانا عتیق الرحمان سنبھلی، قدرے بڑی تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۵۱۲، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: الفرقان بک ڈپو، ۱۱۴/۳۱ نظیر آباد لکھنؤ۔

یہ احساس کہ قرآن پاک اس اعتبار سے تو بہت آسان ہے کہ کہیں سے بھی پڑھیے، اپنے رب کی معرفت کا کچھ حصہ حاصل ہوجاتا ہے ...... لیکن وہ جو کسی کلام کے اجزا میں معنوی ربط ہوتا ہے اس کا رشتہ، باریکیوں کی بنا پر بہت کم مفسرین کی توجہ حاصل کرسکا اور اسی کی وجہ سے آیتوں کے مابین ربط تلاش کرنے میں ذہن کو پریشانی لاحق ہوتی ہے، زیر نظر کتاب کی تالیف کا اصل سبب ہے، درس قرآن کی محفلوں میں فاضل مولف نے اس مشکل کے حل کی کوشش کی اور یہ مقصد ان کے پیش نظر رہا کہ ”گو آیتوں کا نظم و ربط اہم مسئلہ ہے تاہم اصل ہدف قرآن کی شکل میں نور ہدایت کا حصول ہے اور یہ بھی کہ شاید کسی طالب علمانہ ذوق والے کو کسی آیت کے فہم میں آسانی ہوجائے“، زیر نظر کتاب سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی تسہیل و تفہیم تک محدود ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں کو بڑی موثر، دل کش اور مستند ترجمانی اس طرح کی گئی ہے کہ قاری اور سامع کے ذہن میں اگر کوئی سوال ہے تو خود بخود اس کا جواب مل جاتا ہے، ھدی للمتقین کے تحت کہا گیا کہ ”خوان ہدایت کا سب کے لئے عام ہونا الگ بات ہے اور اس سے مستفید ہوسکنا ایک بات، استفادے کے لئے اللہ کی نادیدہ ہستی اور اس کی شان ربوبیت کے فطری شعور کا زندہ ہونا، تقوی کا وصف ہے“، یہی انداز آخر تک قائم ہے، ایک اور خوبی صاف سادہ اور خوب صورت زبان ہے، جس نے بیان کو اور زینت بخشی ہے وہ ہیں تو لکھنؤ کے لیکن زبان پر دلی کا اثر ہے، طرز بتاتی ہے اور واہ ماری سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے، فاضل مفسر نے تدبر قرآن اور روح المعانی سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے، چند باتوں سے قطع نظر ان کی نظر میں قرآن فہمی کے لئے تدبر قرآن سے بہتر کتاب اردو میں نہیں، عمر اور قوی کے حوالے سے ان کو اپنی اس آرزو کی تکمیل کی حسرت ہے کہ باقی پورے قرآن مجید کے بھی ایسے ہی مطالعہ کی سعادت میسر آجائے، لیکن اس آرزو کی

گنجائش قرآن والے کے لئے کیا مشکل ہے؟ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عمر میں درازی و برکت عطا فرمائے، تاکہ پورے قرآن مجید کی تفسیر کی تکمیل اسی انداز سے ہوسکے۔

نواسہ نبی ﷺ حسین ابن علیؓ: از جناب سید علی اکبر رضوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۵۵۲، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: افتخار بک ڈپو، اسلام پورہ، لاہور اور محفوظ بک ایجنسی، امام بارگاہ شاہ نجف، مارٹن روڈ، کراچی۔

سیدنا حضرت حسینؓ کی سیرت اور ان کی کتاب زندگی کے سب سے سنگین و رنگین باب سانحہ کربلا پر مشتمل یہ کتاب عقیدت کی روشنائی سے لکھی گئی اور دل پُر داغ کی شکل میں ایک گلدستہ ہے جو روضہ شبیر کی نذر ہے، سیرت حسین کے غیر کربلائی نقوش گو مختصر ہیں لیکن ان کو بھی سلیقے سے یکجا کیا گیا ہے، ساڑھے پانچ سو صفحات کی اس کتاب میں یہ ابتدائی باب جو ولادت، حدیث کساء اور واقعہ مباہلہ اور حضرت علیؓ وحسنؓ کی وصیتوں پر مشتمل ہے، قریب چالیس صفحات میں ہے باقی قریب پانسو صفحات کربلا اور اس کے متعلقات کی نذر ہیں اور ان کا تسلسل واقعی فاضل مصنف کے سلیقے کا شاہد ہے، کتاب میں بار بار اسی مضمون کی تکرار ہے کہ حضرت حسینؓ نے یزید کو ختم کرنے کی بجائے یزیدیت کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا، ان کے نزدیک یزیدیت یقیناً ختم ہوجاتی اگر عوام دین پر عمل پیرا ہوجاتے اور یہ کہ یزید کے زمانے میں اسلام سے انحراف آخری حدیں چھو رہا تھا، ایسی حالت میں حضرت حسینؓ پر "قیام" فرض تھا، اس لئے کہ ان کو وہ سب کچھ معلوم تھا جو اس زمانے کے اور صحابہ کرامؓ کو معلوم نہ تھا، فاضل مصنف کا خیال ہے کہ حضرت حسینؓ نے دنیا کے ہر فرقہ، ہر مذہب کو راہ حق پر مرنا سکھایا، یہ جملہ شاید جوش عقیدت کا نتیجہ ہے اور یہ بھی کہ "ایک ایسا زمانہ یقیناً آئے گا جب حسینیت ہی اس کرۂ ارض کا مذہب ہوگا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد کہا گیا کہ مسجد نبوی سنسان ہوگئی کہ یہ رسول اللہ کی حیات طیبہ میں دین و دنیا کے تمام مسائل کا واحد مرکز تھی لیکن اب یعنی خلافت صدیقؓ کے بعد یہ عموماً دنیوی مسائل تک محدود ہوگئی، یہ بتانا بھی ضروری سمجھا گیا کہ بنی امیہ میں حضرت عثمانؓ واحد فرد تھے جو ابتدا میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، ان کے علاوہ باقی سارے بنی امیہ فتح مکہ کے بعد جبراً وقہراً حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے اور یہ کہ رسول اللہ نے اپنے کچھ اصحاب کو سمجھایا بھی کہ انہوں نے زبان سے لا الہ الا اللہ

ضرور کہا ہے لیکن ان کے دل ابھی زنار پوش ہیں، اس تمہید کے بعد یزید اور اس کے لشکر کے مظالم کا وہی تذکرہ ہے جو مراثی کی روح اور شان ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ مصنف نے ازخود سوال قائم کیے اور پھر ان کا جواب اپنے دستیاب مصادر کی مدد سے دیا مثلاً یہ کہ حضرت حسینؓ نے مکہ سے روانگی کا قصد کیوں کیا؟ انصاران حسینؓ کی قلت کیوں، قیام حسینؓ کیوں اور شہادت حسینؓ سے کیا سبق ملتا ہے؟ وغیرہ، آخر میں چند علما و مستشرقین کے بیانات اور شعرا کا کلام بھی ہے اور صاحبان منبر ومحراب سے یہ التماس بھی کہ واقعات کربلا کے بیان میں محض جوش جذبہ اور خطابت نہ ہو، خطابت کو اصلاح حال اور تبلیغ دین کے لئے استعمال کیا جائے، ان مجلسوں سے ذہنی تعمیر کا کام لیا جائے اور ہر قسم کے دکھاوے سے پرہیز کیا جائے کیوں کہ اصل مقصود تو مقصد حسینؓ ہے۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفی، تحقیقی وتنقیدی جائزے: مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۳۶۰، قیمت: ۲۰۰ روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی نمبر-۲۔

نشاط آمیز وجدان اور الفاظ کو پس وپیش اور مضمون کو کم وبیش کرکے اپنی شاعرانہ شناخت کو قائم کرنے والے شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی انفرادیت، باقی اور تنازعوں کے باوجود آج تک برقرار ہے، میر وسودا، ناسخ وانشا اور مومن وغالب کے ہجوم ہنرمنداں میں وہ جدا بھی ہیں اور ممتاز بھی لیکن ان کا مطالعہ جس کشادہ اور متنوع ادبی وذہنی سیاق میں مطلوب ہے، اس کی کمی کا احساس بھی بے جا نہیں، شاید اسی احساس کے تحت ۲۰۰۳ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نے ایک بڑے سمینار کا انعقاد کیا تھا، زیر نظر کتاب میں اسی سمینار کے اکثر مقالات شامل ہیں، ایک مضمون پروفیسر احتشام حسین کا الگ سے شامل کیا گیا ہے جو مصحفی کے اس فارسی دیوان کے بارے میں ہے جو دیوان نظیری کے جواب میں لکھا گیا تھا، باقی شمس الرحمان فاروقی سے ڈاکٹر وسیم بیگم تک مختلف محققوں اور نقادوں کے مقالات شاید اسی سمینار کا ثمرہ ہیں، فاروقی صاحب کا مضمون ان کے خاص رنگ میں ہے، اتفاق کی بات یہ ہے کہ رنگ طرز روش، طور، اسلوب اور اسٹائل کے فرق اور معنویت پر بھی اس مضمون میں ضمناً تاہم مفصل بحث بھی آگئی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ محمد حسین آزاد کو امروہہ سے کیا پرخاش تھی، آگے پھر لکھتے ہیں کہ خدا کے

لئے کوئی یہ تو بتائے کہ یہ ”امروہہ پن“ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دوسرے فاروقی فاضل پروفیسر نثار احمد کے مضمون میں متصلاً موجود ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مصحفی کی شاعری کے رموز وعلائم میں اور زبان وبیان میں امروہہ پوری طرح جھلک رہا ہے کہ وہ امروہے کی زبان اور محاورے کے بہترین نمائندہ ہیں، اس کی مزید تشریح بھی ہے کہ ”عوامی اردو کی مثالیں اتنی بہتات کے ساتھ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں ملتیں“ خود شمس الرحمان فاروقی نے جو تخیل اور فکر کی بے باکی، روایتی مضامین سے اجتناب، دیسی الفاظ کی تلاش اور معاصر دنیا کے شعور جیسے امتیازات گنائے ہیں وہ خود ان کے سوال کا جواب ہیں، ہاں اگر اشراف کے مقابلے میں مصحفی کا راج پوت کلال ہونا ثابت ہے تو محمد حسین آزاد کی پھبتی کا مطلب شاید یہی ہو، مقالہ نگاروں میں پروفیسر خلیق انجم، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر نور الحسن نقوی جیسے بزرگ نقادوں کے ساتھ ظفر احمد صدیقی اور شمس بدایونی وغیرہ نقادوں اور محققوں کی نئی نسل کے نمایاں نام ہیں، اس طرح مصحفی کے مطالعہ میں اس مجموعہ مضامین کی جامعیت ظاہر ہے، پروفیسر خلیق انجم نے مصحفی کے حوالے سے ایک جگہ یہ جملہ لکھا کہ ”قرآن شریف کا متن تفسیروں سے مدد لیے بغیر حرف حرف میرے سینے میں محفوظ ہے“، کاظم علی خاں کے مقالے میں یہ جملہ ہے کہ ”لکھنؤ دنیا کا وہ واحد شہر ہے جہاں مصحفی نے اپنی زندگی کا سب سے زیادہ زمانہ گزارا“ اور اس سے بھی زیادہ یہ جملہ کہ ”مصحفی کے آخری مسکن ومدفن ہونے کا شرف دنیا میں جس واحد شہر کو حاصل ہے وہ لکھنؤ ہے“، کتابت البتہ اس مجموعہ مضامین کے شایانِ شان نہیں، بے شمار اغلاط سے پڑھنے کا لطف جاتا رہتا ہے۔

یادوں کے چراغ: از جناب محمد فاروق اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۳۳۶، قیمت: ۱۵۰ روپے، پتہ: اعظمی ہاؤس، مکان نمبر ۷-ب (C7/B) ڈاکٹر اقبال کالونی، بیرون جلگاؤں مہاراشٹر اور مکتبہ جریدہ ترجمان، اہل حدیث منزل، اردو بازار، نزد جامع مسجد، دہلی۔

عمر گذشتہ کے ہر نفس کو یادوں کے دائرے میں سمیٹے رکھنا گرچہ مشکل ہے لیکن یہ حوصلے کی بات، اس کتاب میں اسی حوصلہ کا اظہار اس سلیقے اور سادگی سے ہوا ہے کہ اثر پذیری میں ذہن ودل دونوں یکساں طور پر شریک ہوجاتے ہیں جن کی یہ سرگزشت ہے، ان کی شناخت

معلم کی ہے، ایک معلم کی کہانی میں ظاہر ہے چکا چوند کہاں؟ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ایک متوسط اور عام آدمی کی کہانی بھی چھوٹی چھوٹی آرزوؤں اور خوشیوں، کامیابی اور ناکامی اور تلخی وشیرینی کا مرقع بن سکتی ہے اور اپنے طبقے کے بے شمار افراد کی زندگی کے کارواں کے لئے روشنی اور رفاقت کا سامان ہوسکتی ہے، اس خودنوشت کے معلم مصنف کی زندگی کا آغاز مشہور قصبہ مبارک پور کے ایک چھوٹے گاؤں سے ہوا اور گردش روزگار نے ان کو آخر کار مہاراشٹر کے جلگاؤں کا شہری بنادیا، یہ سفر دل چسپ ہونے کے ساتھ اپنے جلو میں انسانی مزاج وطبیعت کے مختلف رنگ بھی بکھیرتا جاتا ہے، خاص طور سے بچپن اور طالب علمی خصوصاً اعظم گڈھ کے شبلی کالج میں ان کے زمانہ تعلیم کی روداد اگر بڑی دل چسپ ہے تو جلگاؤں میں ان کی تدریسی سرگرمیوں میں بصیرت و عزیمت ہے، اعظم گڈہ اور جلگاؤں سے تعلق رکھنے والوں کے لئے اس داستان میں نشاط کا سامان فطری ہے لیکن دوسروں کے لئے بھی یادوں کے اس مینا بازار میں بڑے کام کی چیزیں ہیں، ایک اور بڑی خوبی، بیان کی سادگی، خلوص بلکہ معصومیت ہے، بزرگوں کا ذکر ہو یا اساتذہ وتلامذہ یا اعزہ واحباب کا، قلم کی نبض لکھنے والے کی شخصیت کی کیفیت کی سچی غمازی کرتی جاتی ہے، مصنف کا خیال ہے کہ علمی دنیا کے لئے کتاب نقطہ موہوم سے زیادہ نہیں لیکن سچائی یہی ہے کہ خودنوشت سوانحی ادب میں یہ ”کتاب مرقوم“ ہے، البتہ فہرست کا نہ ہونا اور درمیان میں کئی جگہ صفحات کا خالی رہ جانا، روشنی کی کمی کا احساس دلاتا ہے۔

اکزکیویشن آف ٹرتھ EXCAVATION OF TRUTH: از جناب کے۔ ایم-ایس خاں (خان محمد صادق خاں) مرتبہ جناب خان احمد عدیل، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات: ۱۳۸، قیمت: ۳۵۰ روپے، پتہ: کنشکا پبلشرس، ڈسٹری بیوٹرس 21A-۴۶۹۷/۵، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی نمبر-۲۔

۱۸۵۷ء کی پہلی عوامی تحریک آزادی کو اب ڈیڑھ سو سال ہوگئے، اس موقع پر ایک بار پھر انگریز سامراج کے تسلط، جبر وظلم، استحصال اور اس کے نتیجے میں غلامی کی زنجیروں سے نجات پانے کی جدوجہد کی سرفروشانہ داستان پھر سے تازہ ہوگئی ہے، یہ زیر نظر کتاب بھی اسی داستان کا ایک حصہ ہے، سرورق پر بعض جملوں سے اس کتاب کا اصل موضوع بھی ظاہر ہے اور وہ یہ کہ ”۱۸۵۷ء کے نامعلوم ابطال“ اور ”مسلمانوں کا کردار، متشددانہ یا قوم پرستانہ“، ان دونوں

موضوعات نے مصنف کو خاص طور پر اس کتاب کی تالیف پر آمادہ کیا، اس کا ذکر انہوں نے تفصیل سے دیباچہ میں کیا ہے اور خود سے سوال کیا ہے کہ آخر اس تحریک آزادی میں مسلمانوں کی شمولیت کو نمایاں کیوں نہیں کیا گیا؟ کیا یہ برادران وطن تھے جنہوں نے فاصلوں کو طول دینا چاہا یا پھر وہ نوآبادیاتی سلطنت تھی جس نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے اپنے نسخہ کو استعمال کیا، مصنف نے پہلے باب میں واضح کیا کہ منگل پانڈے کو ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کا پہلا محرک بتایا جاتا ہے لیکن دستاویزات یہ بتاتی ہیں کہ منگل پانڈے کی کوششوں میں حب الوطنی نہیں خالص مذہبی جذبات شامل تھے، حقیقت یہی ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی اس تحریک کا آغاز مسلمانوں نے کیا تھا، اس سلسلہ میں انہوں نے اعظم گڈھ کے ایک فرزند پیر علی خاں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جنہوں نے عظیم آباد پٹنہ کے ایک متمول شخص میر عبداللہ کے ساتھ مل کر آزادی کی جنگ میں حصہ لیا اور جام شہادت نوش کیا، پیر علی خاں کے ذکر سے عموماً تجاہل برتا گیا شاید اسی لئے مصنف نے قریب نصف کتاب ان کے ذکر کے لئے نذر کردی، باقی ابواب میں مولانا فضل حق خیرآبادی، سید احمد شہید، وہابی تحریک، وارث علی، سرسید احمد خاں اور نانا راؤ، لکشمی بائی، تانتیا ٹوپے وغیرہ کے متعلق بحث کی گئی، ضمناً کارل مارکس اور کنور سنگھ کا بھی ذکر ہے، خاص بات یہ ہے کہ مصنف نے قوی دلائل اور حقائق کا سہارا لیا ہے، پروفیسر عزیز الدین حسین کا یہ کہنا درست ہے کہ مصنف کے تجزیوں سے اتفاق کیا جائے یا نہ کیا جائے، یہ بات بہرحال طے ہے کہ انہوں نے بعض ان سچائیوں کو ضرور پالیا ہے جن سے تجاہل برتا گیا، اس لحاظ سے یہ کم قامت کتاب قیمت میں بہت بہتر ہے اور موجودہ حالات میں تو اس کی افادیت کہیں زیادہ ہے۔

جرائم اور اسلام: از جناب مولانا محمد جرجیس کریمی، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۸۵ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی نمبر ۲۵۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ موجودہ دور، عالمی لحاظ سے، جرائم کا دور بھی ہے، جرم تو پہلے بھی تھا کہ انسانی معاشرے کا ایک لازمہ منفی ہی سہی جرم بھی ہے، پہلے مجرم و منصف کا فرق نمایاں تھا لیکن اب مجرم اور قانون گویا ایک ہی حمام میں عریاں ہیں، اس اجمال کی تفصیل فاضل مصنف نے اس خوبی سے کی ہے کہ موجود دور میں جرائم کی جتنی شکلیں ہیں یعنی اخلاقی،

سماجی، معاشی کے علاوہ جنگی، سیاسی وغیرہ کے ذکر کے ساتھ ان کے اسباب و نتائج کا بھی ذکر ہے، ایک باب میں موجودہ قوانین کی ناکامی پر بحث ہے اور اگلے ابواب میں اسلام کے نقطۂ نظر اور انسداد جرائم میں اسلامی تدابیر اور علاج کا اس جامعیت سے جائزہ لیا گیا ہے کہ شاید ہی کسی پہلو کو تشنہ کہا جاسکے "اسلامی سزاؤں کا مقصد، معاشرے میں سزایافتہ لوگوں کی فہرست میں اضافہ کرنا نہیں ہے بلکہ جرم کی اس جڑ کو کاٹنا ہے جس کی وجہ سے آدمی بے باک ہوکر جرائم کا ارتکاب کرتا ہے"، یہ دعویٰ اس کتاب میں مستند، مدلل اور مسکت ہے، اس عمدہ اور قابل قدر کاوش کے لئے مصنف اور ناشر دونوں مبارکباد کے لائق ہیں۔

آبگینے: از جناب رہبر تابانی دریابادی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت، مناسب، مجلد مع گردپوش، صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۷۵ روپے، پتہ: بزم الفقر بارہ بنکی نمبر ۱۳۲ سراؤگی، بارہ بنکی اور محمد سمیع رہبر تابانی، محلہ چھیچی، دریاباد، ضلع بارہ بنکی۔

نسبتاً کم نام لیکن قادرالکلام شاعر کا پہلا مجموعہ آبلے کے نام قریب دس بارہ سال پہلے شائع ہوا تھا، معارف میں اس کا ذکر بھی ہوا تھا، آبلے کی قدرافزائی ہوئی، خمار و عزیز اور حضرت شفیق جون پوری کے شاگرد رشید تاباں شفقی نے کلام کی تحسین کی، اب آبلے کے بعد شاعر نے آبگینے پیش کیے ہیں، آبلے سے آبگینے کا یہ سفر خود شاعر کے شعری ارتقا کا واضح اشارہ ہے، فکر اور مشق سخن میں اگر مزید پختگی اور بالیدگی زیرنظر مجموعہ میں نظر آتی ہے تو تعجب نہیں اودھ کی معیاری زبان کے ساتھ شاعر کو صالح فکر و کردار کی دولت بھی نصیب ہے، تخیل کی پرواز بھی محدود نہیں، اپنے معاشرے اور ماحول کے کرب کو اپنی ذات کا حصہ بنالینا اس کو آتا ہے اور اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن پالینے سے وہ ناامید بھی نہیں، آنسوؤں کو آبروئے دیدۂ تر کہنے والا اور گریۂ شبنم کا احترام کرنے والا شاعر یقیناً ایک انفرادیت کا احساس دلاتا ہے:

اس کے مرے غموں میں ہے کتنی مطابقت — لہجہ ملے زبان ملے داستاں ملے
صدیوں کی جد و جہد کا حاصل نہ پوچھیے — گم ہوگیا میں خود ہی جب ان کے نشاں ملے
اسے ثواب نہیں نام کی ضرورت ہے — وہ بھیک بھی جسے دے گا اچھال کر دے گا

ایسے اشعار سے مالامال اس مجموعے کے متعلق شاعر کی یہ خواہش بے جا نہیں کہ

ع بہت سنبھال کے رکھنا اس آبگینے کو

ع ـ ص

تصانیف مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

۱۔ اسوۂ صحابہ (حصہ اول): اس میں صحابہ کرامؓ کے عقائد، عبادات و اخلاق و معاشرت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔
قیمت: ۶۰/روپے

۲۔ اسوۂ صحابہ (حصہ دوم): اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔
قیمت: ۸۰/روپے

۳۔ اسوۂ صحابیاتؓ: اس میں صحابیاتؓ کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یک جا کردیا گیا ہے۔
قیمت: ۲۵/روپے

۴۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز: اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ہے۔
قیمت: ۶۰/روپے

۵۔ امام رازیؒ: امام فخرالدین رازیؒ کے حالات زندگی اور ان کے نظریات و خیالات کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔
قیمت: ۹۰/روپے

۶۔ حکمائے اسلام (حصہ اول): اس میں یونانی فلسفہ کے مآخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور پانچویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔
قیمت: ۱۵۰/روپے

۷۔ حکمائے اسلام (حصہ دوم): متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔
قیمت: ۴۰/روپے

۸۔ شعرالہند (حصہ اول): قدما سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ
قیمت: ۸۰/روپے

۹۔ شعرالہند (حصہ دوم): اردو شاعری کی تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔
قیمت: ۷۵/روپے

۱۰۔ تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ذکر کی گئی ہیں۔
قیمت: ۱۲۵/روپے

۱۱۔ انقلاب الامم: سر تطور الامم کا انشاپردازانہ ترجمہ
قیمت: ۵۵/روپے

۱۲۔ مقالات عبدالسلام: مولانا مرحوم کے ادبی و تنقیدی مضامین کا ترجمہ قیمت: ۶۰/روپے

۱۳۔ اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔
قیمت: